جنّت سے نکالی ہوئی حوّا

آپ بیتی

نفیس بانو شمعؔ

جنت سے نکالی ہوئی حواؑ

آپ بیتی

نفیس بانو شمعؔ

ABSHAR PUBLICATIONS

E-62,ABUL FAZAL ENCLAVE,
NEW DELHI PIN: 110025 (INDIA)
PHONE: 6842494

نام کتاب۔ جنت سے نکالی ہوئی حوا (آپ بیتی)
مصنفہ۔ نفیس بانو شمعؔ
اشاعت۔ 1998
کمپوزنگ۔ فلاحی کمپوزرس فون نمبر:۔ 694 6994
سرورق۔ انوار انجم۔ڈیزائن ٹائٹل۔ آدھار ڈیزائنر، تزئین و آرائش۔ امیر احمد
قیمت۔ 150روپے (غیر ممالک سے) 15، امریکن ڈالر
تعداد اشاعت۔ ایک ہزار
طباعت۔ شوبی آفسیٹ پریس، 2818 کوچہ چیلان۔ دہلی 110006
ناشر۔ آبشار پبلی کیشنز، E-62۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی۔ 110025

ہمارے تقسیم کار:۔

- انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی 110002
- سیمانت پرکاشن، 922 کوچہ روح اللہ خاں، دریا گنج، نئی دہلی 110002
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 مکتبہ جامعہ (بمبئی) مکتبہ جامعہ (علی گڑھ)
- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ 9۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ 110002

JANNAT SE NIKALI HUI HAWWA Rs, 150/=
AUTOBIOGRAPHY
BY
NAFIS BANO SHAMA U.S.$ 15=00

یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کے جزوی مالی اشتراک سے شائع ہوئی

انتساب

مُقدّر

کے اُس

قلم

کے نام

جس سے

حوّا کا نصیب لکھا گیا۔

باغِ بہشت سے مجھے، حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

— علامہ اقبال

جس کو اپنا لیا میرے محبوب نے
بے بہا کردیا میرے محبوب نے
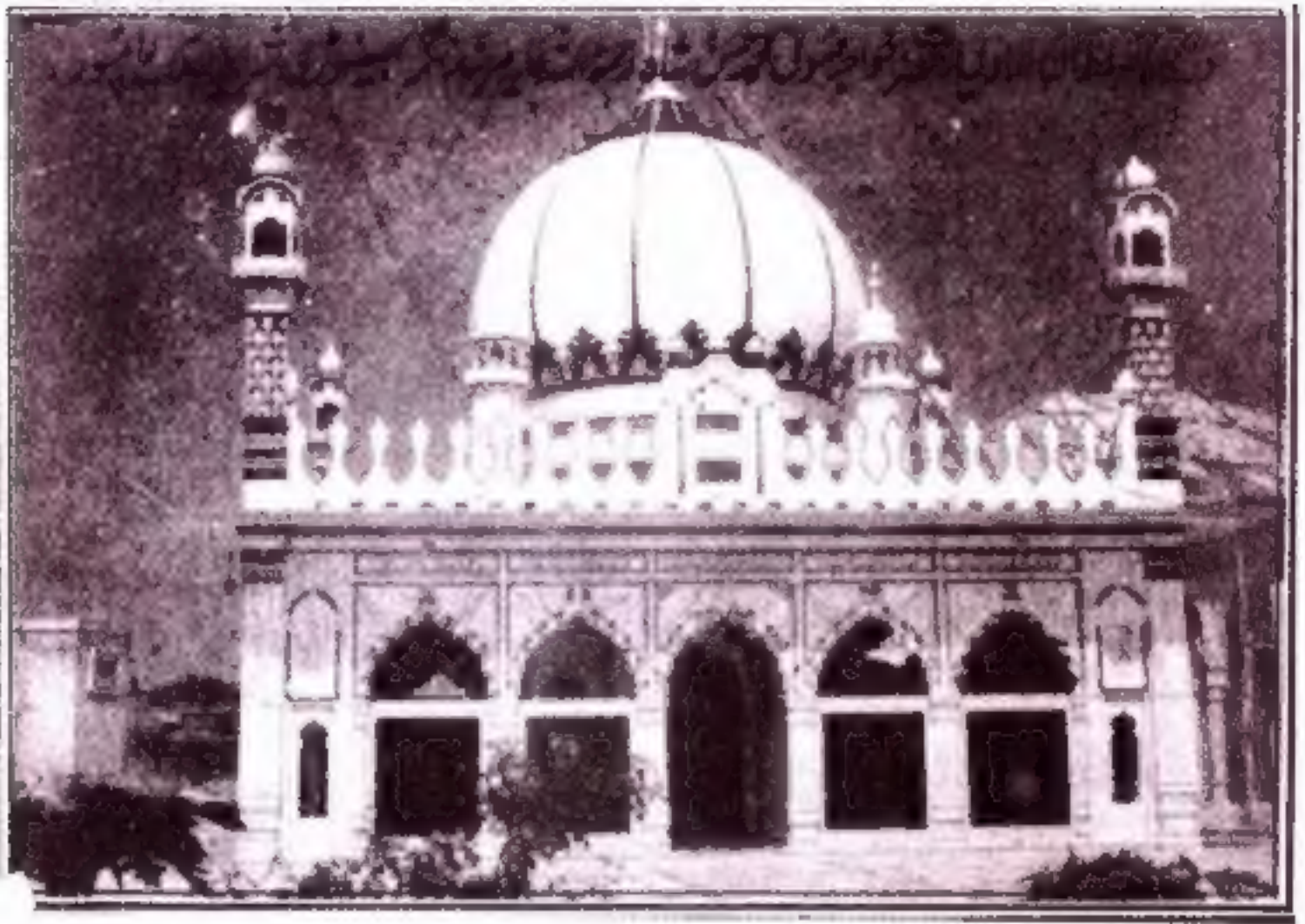
حضور سلطان الاولیاء حضرت صوفی خواجہ محمد حسن شاہؒ میرے دادا پیر ہیں۔ آپ کی ولادت۱۲۹۵ھ میں ہوئی۔ پہلی بار آپ حضرت مستان شاہؒ سے سلسلۂ قلندریہ میں مرید ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ نسبت نسبتِ جہانگیریہ میں ضم ہوگئی اس طرح آپ سلطان العارفین حضرت خواجہ محمد نبی رضاؒ کے دست حق پر بیعت ہوئے۔ آپ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ مزار مبارک بھینسوڑی شریف میں ہے۔ آپ کا عرس 6'5'4 جمادی الاولیٰ کو انتہائی عقیدت واحترام سے منایا جاتا ہے جن میں لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوکر لوگ مرادوں سے اپنا خالی خالی دامن بھرتے ہیں۔ آپ کے فیض کا دریا وصال کے بعد بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ قبلہ دادا پیر کی بارگاہ میں یہ چند سطور نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش ہیں۔

گر قبول افتد، زہے عزوشرف

خاکپائے سلطان الاولیاء
نفیس بانو شمع

ممنون ہوں

اُس لمحہ کی،
جس نے
میری سوچ کو، میرے کرب کو، لفظوں کا پیکر دیا۔
میں شکر گزار ہوں،
جناب مخمور سعیدی صاحب (سکریٹری دہلی اردو اکادمی) ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، ڈاکٹر ابوالفیض سحر صاحب، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر مسعود ہاشمی، ڈاکٹر شمع افروز زیدی صاحبہ، اور ان دوسرے اہل قلم حضرات کی جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری آپ بیتی پر اپنی گرانقدر آراء کا اظہار فرمایا۔
علاوہ ازیں، میں ان شخصیتوں کے تئیں بھی اپنی ممنونیت کا اظہار کرتی ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں مجھے آپ بیتی لکھنے کی تحریک دی اور حوصلہ بخشا۔ آپ بیتی کی تزئین، طباعت اور دوسرے اشاعتی عمل میں جن لوگوں نے تعاون دیا میں ان کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں —— !!

نشانِ منزل

اے جنوں کیوں لئے جاتا ہے بیاباں کی طرف
جب تجھے آنا ہے، گھر کو مرے صحرا کرنا!

ڈاکٹر خلیق انجم

Sec- ANJUMAN TARRAQI URDU
URDU GHAR, RAOUSE AVENVE
NEW DELHI-110002

"مصنفہ کی گرفت"

"آپ بیتی" کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں لکھنے والے کی ذات، اس کا ماضی، خاندان، دوست، اس عہد کی سیاسی زندگی، اور آپ بیتی لکھنے والے کے ارد گرد پیش آنے والے اہم واقعات غرض سب ہی کچھ ہوتا ہے اور زندگی کے یہ تمام پہلو ایک ایسا البم بنادیتے ہیں جس میں زندگی اپنے تمام حسین رنگوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

نفیس بانو شمع کی زیر نظر آپ بیتی۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" عورت کی سچی کہانی ہے۔ اس آپ بیتی کا انتہائی دلچسپ حصہ وہ ہے جو ان کی ذات سے متعلق ہے۔ یہ حصہ تقریباً آدھی آپ بیتی پر محیط ہے۔ باقی آدھا حصہ ان واقعات پر مبنی ہے جن کی نفیس بانو شمع خود عینی شاہد ہیں اور بعض اہم واقعات کی وہ ایک اہم کردار بھی رہی ہیں۔ یہ حصہ بھی دلچسپ ہے۔ اس دلچسپی کی بنیاد یہ ہے کہ مصنفہ تخلیق کار ہے۔ انہوں نے کہانیاں لکھی ہیں "سماج" نام سے ایک ناول بھی لکھ چکی ہیں۔ اس لئے اس حصے پر آپ بیتی سے زیادہ افسانوی انداز غالب ہے۔

یہ آپ بیتی جاگیر دار خاندان کی ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ہندوستان آزاد ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ یعنی اس زمانے میں جب جاگیر داری نظام آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بچے کچھے زمینداری نظام کی آخری صورت زمیندار تھے اور اب زمینداری بھی ختم کر دی گئی تھی۔

نفیس بانو شمع نے جب آنکھیں کھولیں تو دولت کی فراوانی باقی تھی لیکن ابھی چار ہی سال کی تھیں کہ ان کی مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ ان کو آنکھوں کا تارا بنا کر رکھنے والے دادا اور کچھ عرصہ بعد دادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ والد ایک فوجی افسر تھے اور جاگیر دار خاندان کے ایک فرد۔ انہوں نے دوسری شادی کر لی اور پہلی بیوی کو تین بچوں سمیت گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے شمع کی دردناک زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

شمع نے اپنے بچپن کے ایک واقعے کا سہارا لے کر اپنی پوری زندگی پر بہت درد ناک انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ جب وہ بہت کم عمر تھیں اور ان کی نانی انہیں ایک سفر کے دوران گود میں لے کر چلتی گاڑی سے اتر پڑیں تو اترتے ہوئے چار پانچ سال کی بچی بھی نیچے گر پڑی۔ اس واقعہ کو شمع نے درد انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے۔ آپ بیتی میں لکھتی ہیں۔

"دفعتاً ان (نانی) کا پیر پھسلا۔ میں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹرین کے نیچے جا پڑی لوگوں نے سمجھا کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکی ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوا جب ٹرین کی حرکت بند ہوئی تو ایک ہجوم نے دیکھا کہ ٹرین کے پہیے سے میری گردن کا فاصلہ چند انچوں کا تھا۔ قدرت کے اس کرشمہ پر سب محو حیرت تھے مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چند انچوں پر کھڑی موت نے لوح محفوظ پر دیکھ لیا تھا کہ میری موت قسطوں میں لکھی ہوئی ہے۔ میں بڑی سخت جان ہوں۔ ایک بار کی موت میرے لئے کافی نہ ہوگی۔ اس حادثہ کو زمانہ گزر چکا ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ میں اب بھی ٹرین کی لائن پر خوف زدہ سہمی ہوئی پڑی ہوں اور بے شمار ٹرینیں مجھ پر سے گزرتی ہیں اور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی ہوں۔"

ان کی ازدواجی زندگی بھی خوشگوار نہیں رہی۔ جس کی اذیت ناکی اور تلخی کا ذکر انہوں نے کس موثر انداز میں کیا ہے۔

"جب میں پہلی بار ماں بنی تو سوچا بچی کی محبت بگڑے ہوئے باپ کو راہ

راست پر لے آئے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک ہی گھر میں اجنبی کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ضرورتاً گفتگو کر لیا کرتے۔ اول تو وہ گھر میں ہی کم ہوا کرتے تھے جب ہوتے تو ان کی تمام تر توجہ جاسوسی ناولوں پر ہوتی جسے پڑھتے پڑھتے سو جاتے، کسی مسئلہ پر میں بات کرنا چاہتی تو کہتے۔ "مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ صبح بات کر لینا۔ میں ابھی پڑھ رہا ہوں"۔ میری حیثیت جاسوسی ناول سے بھی کم تر تھی۔ یہ ایک دن کی بات نہیں روز کا یہی معمول تھا۔ میں ساری رات کمرے کی چھت کو تکتے ہوئے گزار دیتی۔ روز بروز کوئی شئے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے اندر بکھر رہی تھی۔"

اس کے بعد۔ بقول شمع۔

"کہتے ہیں دکھ کسی کو سنانے سے ہلکا ہو جاتا ہے مگر میری سننے والا کون تھا؟ نہ کوئی ہمدرد، نہ غمگسار، نہ ساتھی، نہ سہیلی، گھر کے در و بام میری سنتے تو تھے مگر درد بانٹ نہ سکتے تھے۔ میری سوچوں کو آخر ایک نئی راہ مل گئی۔ میں نے افسانے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنے غم کو معاشرے کے کرداروں میں بانٹ دیا۔"

اس طرح انہوں نے ادب کی دنیا میں پناہ لی۔ ناول افسانے اور شاعری کا مطالعہ شروع کر دیا اور بہت جلد اپنے اندر چھپی ہوئی شاعرہ اور افسانہ نگار کی دریافت کر لی۔ ان کا کلام اور خاصی تعداد میں افسانے آج کل، بیسویں صدی، ایوان اردو، سیپ (کراچی) آداب عرض (لاہور) میں شائع ہوئے۔

شمع کو کہانی سنانے کے فن پر قدرت حاصل ہے اور پھر یہ آپ بیتی تو خود ان کی اپنی کہانی ہے۔ ایک ایک لفظ سے ان کا ذہنی کرب نمایاں ہے۔ زندگی نے انھیں تکلیفوں، پریشانیوں، اور مصیبتوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا لیکن انہیں تمام چیزوں نے ان کے اندر چھپے ہوئے فنکار کو حساس بنایا اور اپنی بات کہنے کا بہت خوبصورت اور موثر انداز دیا۔ شمع نے اپنی

کہانی بہت دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔
شمع پر مرد نے باپ اور شوہر کے روپ میں ہر ممکن ظلم کیا اور پھر ان کی زندگی میں جو عورتیں آئیں ان میں سے بیشتر ظلم و ستم کا شکار تھیں۔ انہوں نے ان عورتوں کی کہانیاں بھی بیان کی ہیں۔ اس طرح شمع کی یہ کتاب آپ بیتی کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جنہیں ہم منی کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ اس آپ بیتی کا یہ وہ انفرادی پہلو ہے جو اردو کی دوسری آپ بیتیوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفیس بانو شمع نے خودنوشت سوانح میں تجربہ کیا ہے اور وہ بھی ایک کامیاب تجربہ۔ ہر باب الگ بھی ہے اور آپ بیتی سے منسلک بھی۔ گویا ہم ایک زندگی کے ذریعہ کئی زندگیوں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔ قاری خود بھی اس درد کو محسوس کرتا ہے جس کی ترجمانی آپ بیتی میں مختلف کرداروں کے حوالہ سے کی گئی ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ آپ بیتی بہت دردانگیز اور دلچسپ ہے۔ اس آپ بیتی کا پڑھنے والا شروع سے آخر تک مصنفہ کی گرفت میں رہتا ہے اور یہی اس آپ بیتی کی غیر معمولی کامیابی ہے۔

ڈاکٹر ابوالفیض سحرؔ
67-G POCKET VI
FACE Ist, MAYUR VIHAR
NEW DELHI- 110092

ایک نسوانی چیخ

وزیر آغا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ گیت نسوانی چیخ ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں گیت ہی پر کیا موقوف ہے۔ اگر کوئی دبی ہوئی چیخ خاموشی کے پردوں کو چیر کر بلند ہوتی ہے خواہ کسی بھی صورت میں ہو، ایک چیخ ہی ہوتی ہے۔ خاص کر فکشن کے پیرائے میں یہ چیخ بے آواز ہو کر بھی احساسات و جذبات کے گنبدوں کو ہلا کے رکھ دیتی ہے۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" اس کی بہترین اور موثر مثال ہے جو نفیس بانو شمع کے قلم کی سرسراہٹ میں پوشیدہ ان آوازوں کی ترجمان ہے جو عورت اور اس کی زندگی کے مختلف موڑ، پیکر اور کردار دھڑکنوں اور سانسوں کے روپ میں بلند ہو کر انسانی احساسات و جذبات کی جھیلوں میں تموج پیدا کر دیتی ہے۔

غالباً یہ ایک فطرت کی ودیعت ہے کہ عورت زندگی کو بہت قریب سے دیکھتی ہے، محسوس کرتی ہے اور احساس و شعور میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کے رنگ و بو کو اس طرح سمو لیتی ہے کہ آنچل نچوڑ دے تو فرشتے بھی وضو کریں۔

زیر نظر خود نوشت سوانح، ایک ایسی عورت کی کہانی ہے، ایک ایسی روداد ہے، ایک ایسی ہی داستان ہے، جس کے ورق ورق پر عورت کے حساس دل میں موجزن احساسات و جذبات کی تصویریں چلتی پھرتی سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں اور ہمارے ذہن و شعور کو ایسی منزلوں سے آشنا کراتی ہیں جہاں ہمارا سماج، ہمارا معاشرہ اور ہماری دنیا، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر واقعی دم بخود ہو کر زندگی کی حقیقتوں اور فسانوں کو وزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ یہ نہ صرف تخلیقی کرب ہے بلکہ ادب کا منشا اور مدعا بھی ہے، جو زندگی کا حقیقی عکاس اور آئینہ دار ہوتا ہے۔

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

HEAD DEPTT.OF URDU
JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW D1ELHI- 110025

شعلہ بار نفس کی آنچ

''نفیس بانو شمع'' کی آپ بیتی ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' کا عنوان ہی ان کے موجودہ کارنامے کی داخلی خصوصیات کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ کتاب کے چند تراشوں سے یہ اندازہ لگایا جانا مشکل نہیں کہ یہ ایک ایسی زندگی کی سرگزشت ہے جو زخموں سے چور ہے۔ ہر چند کہ اس کہانی میں ظالم اور مظلوم دو الگ الگ کردار نظر آتے ہیں اور ظلم اکثر و بیشتر مرد سے منسوب کیا گیا ہے اور موجودہ تجربات کی حد تک یہ بات صحیح بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس تفریق کو ایک دائمی کلیہ تصور کرنا غالباً صحیح نہ ہوگا۔ میرے نزدیک یہ ایک فرد کی کہانی ہے جو اتفاق سے عورت ہے، متضاد اور متخالف سماجی حقائق اور واردات سے متصادم ہوتے رہنے کے سبب اس کا پورا وجود لہولہان ہو چکا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ اس کا قصور کیا ہے اور اس کے لیے متعین کی گئی سزا کی مدت کیا ہے؟ ہماری موجودہ معاشرتی زندگی میں ہزارہا عورتوں اور مردوں کی یہی کہانی ہے، البتہ نفیس بانو شمع کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی روئیداد کو جس قدر موثر اور دلنشیں پیرائے میں بیان کر سکتی ہیں وہ دوسروں کا مقدر نہیں ہے۔

یہ سرگزشت موجودہ دور میں Women Empowerment کی تحریک کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ عورت خالق کائنات کی صناعی کا ایک عظیم

مظہر اور انسانی زندگی میں توازن، اعتدال اور لازوال مسرتوں کا سرچشمہ ہے جس کے گدلا ہو جانے کا تصور اندوہ ناک ہے۔ نفیس بانو شمع کی کہانی میں ان کے شعلہ بار نفس کی آنچ بہت تیز ہے لیکن یہی آگ خود ان کی روحانی بالیدگی اور ترفع کا بھی واحد وسیلہ ہے جس کے سبب ایک بظاہر تکلیف دہ تجربہ قاری کی اپنی نجات کا بھی ضامن بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر وہاج الدین علوی
DEPTT. OF URDU
JAMIA MILLIA ISLAMIA
NEW DELHI- 110025

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" فن کے آئینہ میں

گزشتہ تین چار برسوں میں بر صغیر کے سوانحی ادب میں پانچ خود نوشتوں کا اضافہ ہوا ہے۔ "بُری عورت کی کتھا" "جو رہی سو بے خبری رہی" "شورشِ دوراں" "ڈگر سے ہٹ کر" اور "جنت سے نکالی ہوئی حوا"۔ ان پانچوں خود نوشتوں میں دو عناصر قدر مشترک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ پانچوں خود نوشتیں خواتین کے قلم کی دین ہیں دوسرے ان ساری خود نوشتوں میں Famenism کا عنصر زیریں لہر کے طور پر کار فرما ہے۔ ہر چند کہ انداز تحریر اور اسلوب مختلف ہیں لیکن جذبہ یکساں ہے۔ سردست مجھے نفیس بانو شمع کی آپ بیتی "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کے سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

خود نوشت یا آپ بیتی لکھنا بہت آسان ہے لیکن اسے ادبی صنف کے طور پر پیش کرنا دشوار ترین مرحلہ ہے۔ خود نوشت نگار کے سامنے واقعات، اشخاص اور جذبات کے ہجوم میں مسئلہ انتخاب کا ہوتا ہے۔ یہ اس کا حسن انتخاب ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے کن واقعات، حادثات اور جذبات کو قاری کے سامنے پیش کرے کیوں کہ اسی انتخاب پر اس کی نیک نامی یا رسوائی کا انحصار ہوتا ہے۔ ہاں اس پیش کش میں سچائی اور دیانتداری کا دامن ہاتھ سے چھٹنا نہیں چاہئے اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور تخیل کی کار فرمائی سے خود نوشت افسانہ بن جاتی ہے۔ دوسرا مرحلہ خود نوشت میں تکنیک اور ہیئت کے انتخاب کا ہے۔ ہر چند کہ خود نوشت نگار ہیئت یا تکنیک کا پابند نہیں ہوتا لیکن

خودنوشت کے لیے بیانیہ کی سیدھی سادی تکنیک بہت موزوں ہے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ فکشن کی تکنیک اپنا کر مصنف نے خودنوشت کی راست بیانی کو تکنیک کے دھندلکوں میں ایسا گم کیا کہ خودنوشت کا محور اظہارِ ذات سے ہٹ کر حدیثِ دیگراں ہو گیا۔ ہاں ان تکنیکوں اور رویوں کے برتنے کا حق قرۃ العین حیدر جیسی عظیم مصنفہ کو حاصل ہے۔ بصورت دیگر "بُری عورت کی بُری کتھا" جیسی خودنوشت وجود میں آجاتی ہے۔

نفیس بانو شمع کی خودنوشت اس لحاظ سے ایک اچھی خودنوشت ہے کہ اس میں بیانیہ کی تکنیک اور افسانوی انداز میں اپنی زندگی کی کہانی دہرائی گئی ہے۔ واقعات کی صداقت کے پیش نظر مصنفہ نے مشرقی روایات کا گلا نہیں گھونٹا ورنہ بہت سے مواقع ایسے آئے تھے جہاں وہ الفاظ کے ذریعہ لذتیت کی کیفیت پیدا کر سکتی تھیں۔ اس خودنوشت میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کی گئی ہے۔ خودنوشت نگار نے شعوری طور پر ان طبقات کی کمزوریوں، محرومیوں، ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیات کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن فلسفیانہ یا ناصحانہ اسلوب سے پرہیز کیا ہے۔ اس خودنوشت میں دیہات، شہر اور قصبات کی زندگی کے Unpainted Faces دیکھے جا سکتے ہیں۔ پوری خودنوشت پر یاس و حرماں کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے مصورِ غم علامہ راشد الخیری کے ناول کا کوئی باب ہو لیکن نگاہ غائر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ نے بے کم و کاست جو ان پر گزری اسے قلم بند کر دیا۔ بقول شاعر۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

غموں کی اس افتاد نے ان کے اندر ایک روحانی کرب پیدا کر دیا جس کی ارتقائی شکل خوش عقیدگی اور دردمندی ہے۔ اس دردمندی نے حُبِ اللہ اور محبت رسول کو ان کے حریمِ دل میں مستحکم اور محکم کر دیا اور خوش عقیدگی نے اولیاء کرام کے آستانوں پر جبینِ نیاز خم کرنے کی توفیق عطا کی۔ جس کی تفصیل خودنوشت کے اوراق میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اپنے پیش رو خود نوشت نگاروں کے برعکس نفیس بانو شمع نے خود نوشت میں دانش ورانہ مسائل اور ادب و سماجیات پر تنقیدی تجزیے پیش نہیں کیے اور نہ ہی سیاستِ وقت اور نامور اشخاص سے اپنے روابط کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ بادی النظر میں ایسا ہونا ایک بھرپور خود نوشت کے لیے ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس خود نوشت کا یہی وصف ہے۔ اس کی سادگی اور روزمرہ زندگی کے واقعات کا حسن قطعی اس کا متحمل نہ ہوتا کہ بقراطی کے ایوانوں میں مسائل، تخیل کی پچی کاری کی جائے۔ میرے خیال میں خود نوشت نگار سے یہ توقع فضول ہے کہ زندگی کے فکری پہلو کو اجاگر کرے یا قاری کی بصیرت میں اضافہ ضرور کرے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ فلاں آدمی زندگی ان اصولوں، ان ضوابط کے تحت گزارے یعنی زندگی اس کی اور جیے ہماری طرح۔ ہم تو یہ توقع کرسکتے ہیں کہ خود نوشت نگار اپنی زندگی کے جس رخ کو پیش کر رہا ہے وہ سچ ہے یا نہیں اور وہ اپنے تئیں دیانتدار ہے کہ نہیں ایک سچی اور اچھی خود نوشت کا یہی وصف ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ نفیس بانو شمع اپنی آپ بیتی پیش کرتے ہوئے دیانتدار اور حق گو رہی ہیں۔ ابھی ان کی ساری زندگی کا سفر جاری ہے۔ زیست کرنے کے بہانے اور مواقع موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں وہ محسوس کریں کہ زندگی صرف گناہ آدمؑ ہی نہیں میراث خلیل بھی ہے۔ اور پھر وہ "فردوس نظارہ" یا "جنت نگاہ" جیسی ترکیبوں کے سہارے بقیہ زندگی کی کہانی پیش کردیں۔ منتظر رہنا ہوگا۔

بہ ہر لحظہ بہ ہر ساعت بہ ہر دم
دگر گوں می شود احوال عالم

ڈاکٹر مسعود ہاشمی

ALL INDIA RADIO
(URDU SERVICE)
NEW DELHI - 110001

"سوانحی ادب میں بیش بہا اضافہ"

نفیس بانو شمعؔ اگرچہ کافی پہلے سے اردو ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے مگر ان کی تازہ کاوش "جنت سے نکالی ہوئی حوا" اردو کے سوانحی ادب میں یقیناً ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ شمعؔ کے قلم کا کمال یہ ہے کہ ان کی یہ "آپ بیتی" اتنی چابکدستی سے "جگ بیتی" بن گئی ہے کہ قاری کو کسی بھی لمحہ یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ ایک ڈوبتی، تیرتی زندگی کی اس کہانی میں خود بھی ایک کردار بن کر رہ گیا ہے۔

مشہور ناول "سماج" کے بعد شمعؔ کے قلم کو روک لگ گئی تھی اور اس کے بعد ان کی کوئی مستقل تخلیق منظر شہود پر نہیں آ سکی تھی مگر "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کے سرسری مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا طوفان کا بند ٹوٹ گیا ہے اور احساس کی شدت سیل بیکراں بن کر سب کچھ بہا لے گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" بذات خود ایک بہت بڑا استعارہ ہے اس عورت کا جو مردوں کی حاکمیت والے سماج میں آن دم تا ایں دم ہر لمحے مر مر کر جینے پر مجبور رہی ہے۔

ان کی آپ بیتی کا یہ اقتباس کہ۔

> "ہمارے معاشرے میں ہر عورت ناچ رہی ہے، کوئی گھنگرو باندھ کر، کوئی بغیر آواز کے، کوئی اتم کمار کے سبق پر، کوئی خاوند کے اشارے پر، کوئی اولاد کی محبت میں، کوئی ظالم کے خوف سے، رقص ہی عورت

کا مقدر ہے۔ جب وہ ناچنا بند کر دیتی ہے وہ ساکت کر دی جاتی ہے اور پھینک دی جاتی ہے، کبھی آگ میں، کبھی پانی میں، کبھی قبر میں" نہ صرف یہ کہ عورت کی کہانی پر ایک بے لاگ تبصرہ ہے بلکہ اردو کے ادب عالیہ میں جگہ پانے کا بھی مستحق ہے۔

اس میں شک نہیں کہ نفیس بانو شمعؔ نے "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کی شکل میں اردو میں سوانح نگاری کو ایک بالکل نئی نہج دی ہے۔ ایک ایسی نہج جو منفرد ہی نہیں ہے، تمام تر تخلیقی بھی ہے، یعنی ایک ایسی تحریر جو اس حد تک سحر آگیں ہے کہ قاری کو دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر کر دیتی ہے۔ یہی شمعؔ کے قلم کا اور فن کا کمال ہے۔

شمعؔ نے اس کتاب میں عورت کی جو کہانی بیان کی ہے ممکن ہے کچھ لوگوں کے نزدیک سبھی عورتوں کی کہانی نہ ہو مگر عورت کے استعارے کے ذریعہ انہوں نے جن حقائق کی نقاب کشائی کی ہے ان کے ابدی ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک چھت کے سائے، تن پر کپڑے، دو وقت کی روٹی، اور بچوں کے لئے ایک باپ کی خاطر، بیوی مجبور ہو کر طوائف نہیں بن جاتی یعنی ایک ایسی طوائف بیوی جس کی حیثیت بچے پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ نہیں ہوتی۔ شمعؔ نے اس درد کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور کامیاب کوشش کی ہے جو کہ اردو ادب میں انہیں ایک معتبر مقام دلانے کی ضمانت ہے۔

ڈاکٹر شمع افروز زیدی
F 17/8, JOGABAI EXTENTION
BATLA JHOUSE,
NEW DELHI- 110025

"جنت سے نکالی ہوئی حوّا، ایک نظر میں"

اردو میں خود نوشت سوانح کی جھلکیاں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ پہلی خود نوشت کس نے قلمبند کی اس کا ثبوت مہیا کرنا انتہائی دشوار ہے۔ اگرچہ اس کے ابتدائی نقوش صوفیاء کرام کے ملفوظات میں مل جاتے ہیں لیکن انہیں ہم آپ بیتی کے ذیل میں شمار کر سکتے ہیں۔ سوانح نگاری کا چلن قدیم زمانے سے ہی ہے۔ تزکِ بابری اور تزکِ جہانگیری وغیرہ سے ہندوستان میں آپ بیتی کے ابتدائی نقوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ بیتی یا سرگزشت کی قدرے ترقی یافتہ صورت کافی بعد میں سامنے آئی اور بہت سی آپ بیتیاں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین، رشید احمد صدیقی، جوشؔ ملیح آبادی، احسان دانشؔ، مشتاق احمد یوسفی، کلیم الدین احمد، مرزا ادیب، گوپال متل، دیوان سنگھ مفتوںؔ، ظہیر الدین دہلوی، عتیق صدیقی وغیرہ نے اپنی اپنی خود نوشت تحریر کر کے اردو ادب میں آپ بیتی کا چلن عام کیا۔ ادھر خواتین میں کشور ناہید، ادا جعفری وغیرہ نے آپ بیتیاں لکھیں۔ دراصل سوانح نگاری کا چلن زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی ذات اور اپنے تجربات و مشاہدات میں دوسروں کو شامل کرنا، اس کے علاوہ انکشاف ذات کا جذبہ انسان میں روز ازل سے ہی پنہاں ہے۔ حالات کی یورش میں انسان جب تنہائی محسوس کرتا ہے تو اپنے آپ کو مصروف کرنے کے لئے وہ ذاتی تجربات کا انکشاف خود نوشت سوانح تحریر کر کے کرتا ہے۔ ایسی ہی کوشش نفیس بانو شمعؔ نے "جنت سے نکالی ہوئی حوا" میں کی ہے۔ نفیس بانو شمعؔ کی

شناخت کئی حوالوں سے ہوتی ہے۔ اولاً انہوں نے افسانے لکھے پھر ذہن شعر گوئی کی طرف مائل ہوا تو شعر کہنے لگیں۔ اور اس میدان میں خاصی معروف ہوئیں۔ اس کے بعد ناول ''سماج'' لکھ کر یوپی اردو اکادمی سے ایوارڈ کی مستحق ٹھہرائی گئیں۔ اور اب ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' لکھ کر خود نوشت سوانح عمریوں میں اضافے کا سبب بن گئیں۔ شمع عمر کے اعتبار سے کم و بیش 40 برس کی ہوں گی لیکن ان کی خود نوشت سوانح پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھا کر انہوں نے کئی برس آگے کی منزلیں طے کر لی ہیں۔ جس طرح آگ میں تپ کر سونا کندن بنتا ہے کچھ اسی طرح شمع نے زمانے کے گرم و سرد دیکھے اور کندن بن گئیں۔ اتنی کم عمری میں آپ بیتی لکھنا کمال کی بات ہے یہ تو اگلے وقتوں کے لوگوں کا کام تھا لیکن شمع نے یہ بیڑا بہت کامیابی کے ساتھ اٹھالیا ہے۔ میں نے جب شمع کی خود نوشت سوانح کے اقتباس پڑھے تو مجھے عجیب و غریب ادراک ہوا۔ بظاہر ہر دم ہنسنے ہنسانے والی اور پھولوں کی سی نزاکت اور فرشتوں کی سی معصومیت اور تقدس والی شمع اندر سے کتنی دکھی اور ریزہ ریزہ ہے؟ میرا دل اندر، بہت اندر تک نامعلوم اداسی سے لبریز ہو گیا۔ شمع کی آپ بیتی تنہا اس کی نہیں پوری عورت ذات کی آپ بیتی بن گئی ہے۔ جب وہ کہتی ہے۔

> ''آدم نے گندم کھایا تو جنت سے نکال دیئے گئے مگر اس بار آدم نے خطا کی تو اس کی سزا صرف حوا کو ملی وہ جنت سے نکال دی گئی۔ محبوبہ کی شرط تھی کہ بیوی کو چھوڑ دو اور پھر تین طلاق کے ساتھ ''
>
> ''ہمارے معاشرے میں ہر عورت ناچ رہی ہے۔ کوئی گھنگھرو باندھ کر، کوئی بغیر آواز کے، کوئی اتم کمار کے سبق پر، کوئی خاوند کے اشارے پر، کوئی اولاد کی محبت میں، کوئی ظالم کے خوف سے، رقص ہی عورت کا مقدر ہے''۔

مندرجہ بالا اقتباس میں کتنے آنسو گھلے ہوئے ہیں۔ کتنی حسرتیں اور کتنی آہیں پوشیدہ ہیں اور حقیقت کی عکاسی کتنی خوبصورتی سے کی گئی ہے اس کا اندازہ ایک حساس دل

ہی کر سکتا ہے۔ شمعؔ نے اپنی خود نوشت کے ذریعہ سماج میں بے آبرو ہوئی عورت کا ذکر بڑی جاں سوزی سے کیا ہے۔ مرد کس کس طرح روپ دھار کر عورت پر ظلم کرتا ہے اس کا نقشہ شمعؔ نے نہایت کامیابی سے کھینچا ہے۔ مرد کبھی باپ بن کر، کبھی بیٹا، کبھی شوہر اور محبوب بن کر عورت کا استحصال کرتا ہے۔ مرد کی ستائی ہوئی عورت کس طرح دربدر اور خوار ہوتی ہے اسے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے شمعؔ نے اس آپ بیتی میں بہت جچے تلے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ عورت ذات کا دکھ اسے اس حد تک دکھی اور بے چین کر دیتا ہے کہ وہ اپنی .... کے لئے بھی ہمدردی کا جذبہ محسوس کرنے لگتی ہے اس سے شمعؔ کے نازک اور خوبصورت دل کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> "وہ بھی میری ہی طرح ایک عورت تھی بالکل میرے جیسی، اس کا نام لکھنے کی ضرورت نہیں، بس وہ عورت تھی! عورت کا ایک ہی نام ہوتا ہے "دکھ"۔ وہ روتی تو میں اپنی آنکھیں آئینے میں دیکھتی کہ پلکوں کا کوئی کونہ بھیگا تو نہیں ہے؟"

آپ بیتی لکھنے کے لئے جس قلم اور دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے وہ دل و دماغ اور قلم شمعؔ کو قدرت نے عطا کیا ہے۔ بیانیہ پر انہیں قدرت حاصل ہے انہوں نے اپنی ذات کا انکشاف جوں کا توں قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ عام طور سے دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ بیتی قلمبند کرتے وقت اکثر حضرات اصل واقعات سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور مبالغے کی آمیزش اس حد تک کرتے ہیں کہ اصل پر ملمع کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اور یہی چیز آپ بیتی کے حسن کو مجروح کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن شمعؔ کی آپ بیتی کا حسن اس کے اصل واقعات میں مضمر ہے۔ وہ کہیں جھجک محسوس نہیں کرتی۔ جہاں ضرورت محسوس کرتی ہے واقعات کو اصل روپ میں پیش کر دیتی ہے چاہے اس سے اس کی نسوانیت ہی کیوں نہ مجروح ہو۔ چونکہ شمعؔ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کے یہاں آپ بیتی میں بھی افسانوی فضا جاری و ساری ہے۔

میری ناقص رائے میں آپ بیتی کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ صرف اپنی

ذات کے حصار میں قید نہیں ہوتی بلکہ کئی نسلوں کے تجربات کا نچوڑ اس میں پنہاں ہوتا ہے۔ اس کینوس پر شمعؔ کی خود نوشت سوانح کو پرکھیں تو وہ کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔ شمعؔ نے کہیں کہیں اشاروں کنایوں میں بھی بات کی ہے کہیں استعاراتی انداز و پیرایہ بھی اپنایا ہے۔ ان کا انداز اتنا دلکش و دل پذیر ہے کہ قاری کی توجہ شمعؔ کی ذات سے ہٹ کر اس کی طرز تحریر میں گم ہو جاتی ہے جیسے:۔

"اکثر ندی کے کنارے کھڑی ہو کر دور تک پھیلے ہوئے صاف و شفاف پانی کو بڑے انہماک سے دیکھتی پھر دونوں ہاتھوں سے پانی اٹھا کر سطح پر اچھال دیتی اور من ہی من میں مسکراتی۔ اس مسکراہٹ کا مطلب کون جانتا تھا میرے نانا؟ یا میرا بچپن؟"

اس اقتباس میں انہوں نے اپنا پورا بچپن سمو دیا ہے۔ آپ بیتی قلمبند کرتے وقت مصنف کے ذہن میں شاید یہ بات رہتی ہے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق خوبیوں کو اجاگر کرے لیکن ان خوبیوں کا اظہار اتنا نازک ترین مرحلہ ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش اور ایک جملے کا غلط استعمال سارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کے مصداق ہوتا ہے لیکن باکمال تخلیق کار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ جزئیات، مہارت اور فنکاری سے اس طور رنگ آمیزی کرتا ہے کہ اس کی ذات کی تصویر از خود ابھر کر سامنے آجاتی ہے جیسے۔

"سورج کے بعد ساری آگ میرے ہی حصے میں آئی تھی مگر مجھے دکھ نہیں فخر ہے اور احترام کرتی ہوں اس آگ کا جس نے میرے باطن سے غم کے سوا تمام چیزیں جلا کر خاکستر کر ڈالیں"۔

ان تین لائنوں میں محسوس کریں مصنفہ کو اپنے اس غم پر فخر ہے اور وہ انہیں سینے سے لگاتے ہوئے بھی خوش ہے۔ یا پھر!۔

"چراغوں کا درد ہر کوئی کہاں سمجھتا ہے؟ صبح دیکھا تو طاق کے محراب میں چراغ خاموش تھا اور دھوئیں کی سیاہی میں میرا اجلا اجلا بچپن سو رہا تھا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئی"۔

مندرجہ بالا اقتباس میں شمعؔ نے کتنے خوبصورت پیرائے میں اپنی ذات کا اظہار کر دیا ہے اور حقائق کو اصل روپ میں پیش کر دینا ہی مصنفہ کا کمال ہے۔ اس کی ذات پر جو ظلم ہوا ہے اسے قدم قدم پر اس کا احساس ہے وہ حساس ذہن و دل کی مالک ہے اور اس ظلم اور اس درد میں اس نے پوری عورت ذات کو شریک کر لیا ہے۔ یہی اس آپ بیتی کی خصوصیت ہے۔ آپ بیتی کی ابتداء اس انداز سے کرتی ہے۔

"میں وہاں کی آہنی دیواریں پھلانگ کر فرار ہو جاتی ہوں کسی راستے کا تعین نہیں تھا، کسی منزل کا خواب نہیں تھا، بس آزادی چاہتی تھی، ایک ایسی آزادی جس میں عورت اپنے جائز حقوق کے ساتھ سانس لے سکے"

گویا وہ عورت کے لئے جائز حق کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایک عورت جو گھر کی چہار دیواری میں مقید ہے دبی اور کچلی ہوئی ہے اپنی ذات کو فراموش کیے ہوئے ہے، اسے شمعؔ جھنجھوڑتی ہے۔

"ان کا نظریہ تھا کہ مرد کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں یہ ان کا شرعی حق ہے اگر شوہر بیوی کے اخراجات پورے کرتا ہے تو باہر سیاہ و سفید کچھ بھی کرے آخر وہ مرد ہے۔"

ان الفاظ میں شمعؔ نے دبی کچلی اور سسکتی ہوئی عورت کا ذکر کتنے واضح انداز میں کیا ہے کیا عورت کی ضرورت صرف روٹی کپڑا ہی ہے، اسے اپنے شوہر کی قربت اور رفاقت کی ضرورت نہیں۔ مصنفہ کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس کی وہ قدر نہیں کی گئی جس کی وہ مستحق تھی، اسی لئے اس نے زندگی کی سچائیوں کو بڑی سفاکی اور بے باکی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ بیانیہ میں اتنا درد ہے کہ قاری نامعلوم سی اداسی میں گھر جاتا ہے اور شمعؔ کے درد میں خود کو برابر کا شریک سمجھتا ہے اور یہیں پر آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔

شمعؔ کا انداز کہیں کہیں باغیانہ بھی ہو گیا ہے وہ کہیں دلیری سے مردانہ وار مقابلہ کرتی نظر آتی ہے تو کہیں پسپائی اس کا مقدر بنتی ہے۔ یادوں کی یلغار اسے بہت بے چین کرتی ہے تو وہ کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ جاتی ہے اور صفحۂ قرطاس پر اس کے بے آواز آنسو ٹپ ٹپ

گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی ان آنسوؤں کو بے دردی سے پونچھ کر مقابلے کے لئے ڈٹ جاتی ہے تو کبھی خاموشی سے سہ لیتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس آپ بیتی کے ذریعہ بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام واقعات شمعؔ نے من و عن قلمبند کر دیئے ہیں۔ وہ جب اپنے شب و روز کا ذکر کرتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھرے بازار میں تنہا کھڑی ہے تو کہیں ہجوم بے کراں میں گھری ہوئی کراہ رہی ہے، تڑپ رہی ہے، اس کے اندر ایک آگ ہے جس کے شعلے اس کی روح کو جھلسا رہے ہیں، فنا کر رہے ہیں۔ جب یہ آگ زیادہ شدت اختیار کرتی ہے تو اس کے شعلے لپک کر دوسروں تک بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن پھر ایسا لگتا ہے کہ یہ آگ سرد پڑتی چلی جاتی ہے۔ شمعؔ کا بیانیہ فطری اور حقیقت سے قریب ہے۔ اسلوب سادہ، پر اثر انداز بیان، تحریر صاف، شستہ اور دلنشین ہے۔ خارجی کیفیت کی بہ نسبت داخلی کیفیت کا بیان دشوار ترین مرحلہ ہوتا ہے لیکن شمعؔ نے یہ مرحلہ نہایت کامیابی سے طے کر لیا ہے۔ لفظ ہیرے ہوتے ہیں اور انہیں مناسب مقام پر جڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں لیکن شمعؔ نے یہ کام کر دکھایا ہے اور اس کی اسی خوبی نے اسے وہ مقام عطا کر دیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ سچائی، فن اور ذات کا اظہار آپ بیتی کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر آپ بیتی ادھوری ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں سے مزین آپ بیتی شمعؔ نے قارئین کے سامنے پیش کر دی ہے اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

فصیح اکمل
SEA BREEZE COMPLEX
VASAI- THANA (MS)

ہزار داستان عورت

اس وقت اگر اپنے تیس بتیس سالہ ادبی سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھوں تو روشنیوں کے کئی باب کھل جائیں گے۔ وجدان کی قندیل میں کئی چہرے اپنی پوری آب و تاب سے آج بھی روشن ہیں، احساس کا ہلکا سا ارتعاش، اس قندیل میں چہرے بدلتا رہتا ہے اور میں ماضی کے حسین لمحات میں محو ہو کر مسکرا دیتا ہوں۔

کئی پھول تھے کبھی ہم نفس، کئی چاند تھے کبھی ہم سبق
جو پڑھو تو کتنی حسین ہے یہ کتاب عمر ورق ورق

وقت کے ساتھ عورت کی آرائش و زیبائش کے انداز ہی نہیں بدلتے فکر و احساس کے زاویے بھی تبدیل ہوتے ہیں۔

اساطیری داستانوں سے لے کر آج تک کے عہد تک عورت کی تعمیری اور تخریبی صلاحیتوں کی ایک تاریخ ہے جو درس وفا بھی ہے اور درس عبرت بھی۔

ہر حسین عورت ذہین اور باصلاحیت ہو یہ کہاں ممکن ہے، زندگی کے گزشتہ ابواب کئی حسین چہروں سے سجے ہوئے ہیں۔

ہم قافلۂ حسن کو ٹھہرائے ہوئے ہیں
اس دل میں کئی چہرے جگہ پائے ہوئے ہیں

94ء کی ایک شام بمبئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک واجبی "علیک سلیک"

رفتہ رفتہ اپنا دائرہ تنگ کرتی رہی۔ 95ء میں دہلی آیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور رمضان المبارک کا مقدس مہینہ تھا۔ میرے ساتھ بمبئی کے ایک پروڈیوسر اور ایک بلڈر بھی تھے۔ ہم لوگ رنجیت ہوٹل میں ٹھہرے۔

کسی دوست کو فون کرنے کے لئے دہلی کے نمبر دیکھ رہا تھا کہ ایک واجبی "میک سلیک" اپنے نام اور نمبر کے ساتھ سامنے آگئی، نمبر ڈائل کئے تو خلوص کی مہک محسوس ہوئی۔ افطار کے بعد ملاقات طے ہوئی۔

تصنع اور تکلف کے باوصف میں ابوالفضل انکلیو سے اس رات خلوص ویگانگت کی ہی نہیں اظہار میں فکر واحساس کے کھرے رویے کی گرمی لیے واپس رنجیت ہوٹل پہنچا۔ رات دیر گئے تک اچھے برے خیالات کی لہریں اپنے دائرے بناتی رہیں اور پھر میں سو گیا۔

حسن اگر اظہار کے سلیقے پر قادر ہو تو بیانیہ شعری ہو یا نثری دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

میری ادبی وشعری زندگی کے پندرہ سال بمبئی جیسے بھاگتے دوڑتے شہر کی ہماہمی میں ایسے ڈوبے کہ لکھنا تو دور کی بات ہے پڑھنا بھی بس گاہے گاہے رہ گیا۔

رسائل کے وسیلے سے ایک سمٹی سمٹائی عورت اپنے شعری اظہار سے ہم عصر شاعرات میں کچھ مختلف معلوم ہوئی۔ چونکنا فطری بات تھی لیکن ٹھہر کر غور کرنے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی فرصت کہاں تھی؟

ایک سال پھر ڈوب گیا۔ ہاں اس دوران دہلی سے بمبئی آتے ہوئے ٹرین میں وہ ناول ضرور پڑھ لیا تھا جس کو اس نے ایک نشتر ناول کے دعوے کے ساتھ "سماج" کے نام سے لکھا تھا۔

اس ناول پر اگر فلم بنے تو ضرور کامیاب فلموں میں شمار کی جائے گی اور "بھیا فارمولہ" فلموں کی بھیڑ میں اس فلم کی نمایاں پہچان بنے گی۔

کئی بار جی چاہا کہ اس ناول کو فلم کی طرح لکھا جائے یا خود "سماج" کی تخلیق کار کو یہ زحمت دی جائے۔ مگر وہی انتشار وہی مصروفیت۔

دہلی میں نہ جم کر کبھی ملاقات ہوئی نہ کھل کر بات۔

بہت زیادہ کھلنا شاید اسے پسند بھی نہیں۔ اور کھولنے کی کوشش یوں بھی نہ کی کہ جو عورت ایک مرد کے ہاتھوں مختلف سرد رویوں کا شکار ہو کر محض اپنی حوصلہ مندی کے سہارے شکستہ دل کے ساتھ زندگی سے جوجھ رہی ہو۔ اسے اپنی تسکین ذہن و نظر کے لئے مسکرانے پر مجبور کرنا اخلاقی بد دیانتی سا محسوس ہوا۔

جب اس کی جھکی جھکی آنکھیں اشعار کے ذریعہ اپنا درد بیان کرتیں تو دل میں ایک ٹیس سی محسوس ہوتی اور خیال آتا کہ ایسی ریزہ ریزہ عورت کے یہاں خلوص کی گرمی اور روا داری کا جذبہ سلامت ہے یہی بہت ہے۔ ایسی روم روم محبت سے مہکنے والی عورت کو اگر زندگی کے پہلے سفر میں شجر سایہ دار مل گیا ہوتا تو آج یہ عورت یوں نہ ہوتی کچھ اور ہوتی۔

ایک کامیاب بیوی اور اپنے بچوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی ماں۔ صرف ایک ماں۔ جو وہ اب بھی ہے۔

بمبئی سنٹرل پر جس لٹی پٹی عورت سے میرا بس یونہی تعارف ہو گیا تھا۔ وہ اندر سے ایسی "وِش کی پڑیا" نکلے گی یہ اندازہ تو بہت بعد میں ہوا۔

اور آج میں نے اس کی آپ بیتی "جنت سے نکالی ہوئی حوا" کے کچھ ابواب پڑھے تو اس کی صاف بیانی، سچ کو من و عن بیان کرنے کا حوصلہ، الفاظ پر گرفت اور ان کو برتنے کا سیقہ، اس کے ساتھ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کے اسرار و رموز۔ تصوف کی اصطلاحیں، قرآن و حدیث کے حوالے اور ہر واقعہ کے اختتامیہ پر ایک کاٹ دار جملہ۔ عیاش مردوں کی بدفعلیوں سے ابھرتی سسکیاں، کراہیں اور دل گداز چیخیں اور ان سب کے ساتھ ہر منظر کے طاق پر اس کے اپنے کرب کی "شمع"۔

میں واقعی حیران رہ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ کیسی ہزار داستان عورت ہے جس نے اپنے باطن کے نہاں خانے میں زخموں کی دکانیں نہیں پورے پورے بازار سجا رکھے ہیں۔

آپ بیتی بیان کرنے کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہے اس میں اچھے اچھوں نے ریا کاری سے کام لیا ہے۔ لیکن اس عورت نے جس منظر کو جس طرح دیکھا۔ جس داستان کو جس طرح سنا اسے اسی طرح بیان کر دیا۔ نہ ایک حرف زیادہ نہ ایک حرف کم۔

یہ آپ بیتی مختلف نسوانی کرداروں کا احاطہ بھی کرتی ہے جن سے اس کی ملاقات کہیں محض حادثاتی ہے کہیں واقعاتی۔ سماج کی پس پردہ تلخیوں، عیاریوں اور منافقانہ رویوں پر اتنے خلوص اور حوصلے کے ساتھ قلم اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔ جو لوگ ان حقائق سے جان بوجھ کر گریز کرتے ہیں وہ گندگی کے ڈھیر پر مخمل کی چادر بچھائے آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔

ممکن ہے کچھ لوگوں کو بعض مناظر اور داستانوں کے کچھ حصے غیر اخلاقی محسوس ہوں لیکن حقیقت وہی ہے جس کا اظہار اس آپ بیتی میں بہت واضح انداز میں ہوا ہے۔

مرد اپنے ظالمانہ برتاؤ پر عورت کے ماتھے کی شکن بھی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے، پھر یہ تو اس کے دوہرے کردار کی پوری پوتھی ہے۔ اللہ خیر کرے۔

نفیس بانو شمع میں دھڑکتے دل سے تمہیں مبارک باد دیتا ہوں، تمہارے کھرے اظہار پر۔ اور دعا گو ہوں کہ خدا تمہارا ہی نہیں تمہاری ''آپ بیتی'' کا بھی انجام بخیر کرے۔

ڈاکٹر تابش مہدی
BAITUR-RAZIYAH
G-5/A, ABUL FAZL ENCLAVE
JAMIA NAGAR, NEW DELHI-110025
PH : 684 0736

نفیس بانو کی آپ بیتی

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" کوئی ناول ہے نہ کہانی، بلکہ یہ ایک دکھی دل شاعرہ نفیس بانو شمع کی غم واندوہ سے بھرپور روداد زندگی ہے۔ ایک ایسی روداد زندگی جسے پڑھ کر پتھر بھی موم بن کر پگھلنے لگیں۔

نفیس بانو شمع اردو حلقے کے لیے اجنبی وگم نام نہیں ہیں، وہ اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے ذریعہ اردو کے ایک بہت بڑے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہیں۔ تقریباً بیس برس سے اردو کے قابل ذکر رسائل میں ان کی غزلیں اور افسانے شائع ہو رہے ہیں۔ میں نے ان کی غزلیں بھی پڑھی ہیں اور کہانیاں بھی۔ مجھے وہ اپنی ہر تخلیق میں ایک درد مند فن کار کی حیثیت سے معاشرے کی ناہمواریوں اور انسانیت کی ناقدریوں سے مردانہ وار نبرد آزمائی کرتی ہوئی ملی ہیں۔

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" نفیس بانو شمع کی "آپ بیتی" ہے یہ ضروری نہیں کہ "آپ بیتی" صرف معروف اور عظیم شخصیتیں ہی لکھیں، بلکہ ہر چھوٹے بڑے شخص کی "آپ بیتی" کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ میرے نزدیک "آپ بیتی" کی روایت ایک اچھی اور مستحسن روایت ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں سیموئیل پیپس (Samuel pepys) نے اپنی خود نوشت اس لیے نہیں لکھی تھی کہ وہ کوئی بہت بڑا آدمی تھا بلکہ اپنی خود نوشت کی ہی وجہ سے وہ ایک بڑے آدمی کی حیثیت سے متعارف ہوا اور اب ادب کی تاریخ میں اس کی

ایک حیثیت ہے۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" اگرچہ نفیس بانو شمعؔ کی اپنی آپ بیتی ہے لیکن ان کے اندازِ نگارش کا کرشمہ ہے کہ ؎

جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ نفیس بانو کا ایک ایسا فن ہے، جو انہیں آج کے بہت سارے لکھنے والوں کی بھیڑ میں نمایاں اور ممیّز کرتا ہے۔

میں نفیس بانو کی اس کتاب کی اشاعت پر انہیں تبریک پیش کرتا ہوں، اور ان کے تابندہ ادبی مستقبل کے لیے دعاگو بھی۔

سراج امانی

FDITOR-" SACHCHEY WAQYAT'
1191- QUEENS ROAD
DELHI- 110006

کہانی ابھی جاری ہے

کہتے ہیں کہ دکھ کو پیروں تلے دبا سکو تو جینا آجائے۔ دکھ درد زندگی کا لازمی جزو ہیں مگر جینے کے سلیقے کے اس اصول کو اپنا سکنا کبھی محال یوں بھی ہو جاتا ہے کہ قلم کاروں کی یہ برادری کچھ حساس بھی حد سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ نفیس بانو شمع کو میں نے کئی بار اور بار بار پڑھا ہے اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ درد کی براہ راست سچی اور سادی عکاسی ان کے قلم کی فطرت میں شامل ہے۔

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" شمع صاحبہ کی خودنوشت ہے، یہ سن کر شوق ہوا کہ منظر پر آجائے تو ضرور پڑھوں گا۔ خوش قسمتی سے اس شوق کی تکمیل قبل از وقت ہی ہونی تھی۔ مجھے خودنوشت کا مسودہ اس حکم کے ساتھ موصول ہوا کہ مجھے نہ صرف اسے پڑھنا ہوگا بلکہ اس بارے میں رائے زنی بھی کرنی ہوگی۔

الفاظ کی سادگی واقعات کا تسلسل کچھ اس قدر جی کو بھانے لگا کہ پورا مسودہ پڑھ ڈالا۔ ابتداء سے انتہا تک ایک تجسس بنا رہا۔ درد سے محبت کون کرتا ہے؟ مگر اس درد کے سمندر میں اس قدر مٹھاس محسوس ہوئی کہ شب و روز کے تماشے بھول کر مسودہ میلا کرنا پڑا۔ شمع صاحبہ نے جس قدر کرب کے زہر کو پیا ہے بڑی سادگی سے اس کی عکاسی کی ہے۔ تمثیل نگاری میں تازگی نئی نئی علامتوں کے باعث بہت خوب ہے مثلاً۔

"قبرستان میں قدم رکھتے ہی مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ ایسا لگا ایک

روح کسی قبر میں اپنا جسم تلاش کرنے آئی ہو۔"

"نچلی دونوں منزلوں میں مجرا کرنے والی طوائفیں رہتی تھیں۔ اس اسکول کے چھوٹے سے مندر میں ایک ضعیف عورت جو اتم کمار کی ماں تھی، سفید ساڑی میں ملبوس کرشن جی کی مورتی کے سامنے پوجا میں مصروف رہتی، یہ سب دیکھ کر لگتا گندے نالے کی سطح پر کسی نے مصلیٰ بچھادیا ہو۔"

میں یہ نہیں کہتا کہ ادیبوں کی تنقید کا مصالحہ اس میں موجود نہیں لیکن بہ حیثیت ایک قاری میں نے شمع صاحبہ کے اس سلیقے کو بارہا محسوس کیا ہے کہ دکھ کو پیروں تلے روندنے کی قابل ستائش جسارت بھی محترمہ نے اس سماج میں مردانہ وار کی ہے۔ انہوں نے اپنی اس آپ بیتی میں جگہ جگہ حوصلہ مندی کا سندیسہ بھی قاری کو دیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں۔

"آتش جاں سوز میں جلنا ہی میرا مقدر ہے مگر جانے کیوں کبھی کبھی مسکرانے کو جی چاہتا ہے"۔

واقعات نگاری اگر ایک فن ہے تو اس فن کے ذریعہ شمع صاحبہ نے قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے کی بھرپور سعی کی ہے۔ عنوان۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" ہی سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اتنے نشیب و فراز اتنی جدوجہد کے بعد ایک فنکارہ میں اب بھی وہ تڑپ باقی ہے کہ زندگی سے اسے کچھ خاص مقصود ہے۔ ایک عورت اپنے گزرے ہوئے سفر پر نظر ثانی کرنے کے بعد اپنا ایماندارانہ تجزیہ کرکے اپنی ذات کو سمجھ نہیں پاتی تو آخر کیوں؟ محض اس لئے کہ اندر ابھی بہت کچھ ہے۔ وہ تڑپ جو ایک قلم کار میں تاحیات قائم رہتی ہے وہ شمع صاحبہ کے پاس ابھی زندہ ہے۔ خدا کرے یہ تڑپ تاحیات رہے اور وہ ہم جیسے قارئین کے لئے اچھے اور سچے عبرت نامے فراہم کرتی رہیں۔

تکنیکی اور فنی پہلوؤں کی جانچ پرکھ میں نے دلچسپی کے باعث بھی نہ کی کہ اگر یہ جسارت کی تو کہیں یہ "سوکالڈ" (Socalled) ادبی ناقدین کی بے روزگاری کا سبب نہ ہو!

بازیافت

باری تعالیٰ نے جب آدم کی تخلیق کی اور انہیں جنت میں رکھا گیا تو وہاں ان کا جی نہ لگا۔ کیوں کہ وہ تنہا تھے۔ اور پھر دنیا کے اس پہلے مرد کی تنہائی دور کرنے کے لئے حوا وجود میں لائی گئی۔ یہیں سے نسل انسانی کے آغاز کا خوبصورت سلسلہ شروع ہو گیا۔

عورت نے کائنات میں رنگ بھرا اور اس کا حسن ٹھہری۔ اس کے کئی روپ ہیں، اس کا ہر روپ خوبصورت ہے، چاہے وہ ماں کا ہو، بہن کا ہو، بیٹی یا بیوی کا، مرد کو بعض امور میں عورت پر فوقیت ضرور حاصل ہے لیکن وہ درجے میں اس سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ جس طرح رات کے بغیر دن کا، چھاؤں کے بغیر دھوپ کا، چاند کے بغیر سورج کا، بد صورتی کے بغیر خوب صورتی کا ادراک ممکن نہ تھا اسی طرح عورت کے بغیر مرد کی تکمیل بھی ممکن نہ تھی۔ اگر عورت نہ ہوتی تو اس کا وجود نامکمل ہوتا لیکن المیہ تو یہ ہے کہ ان سب کے باوجود معاشرہ میں عورت کو آج بھی وہ مقام حاصل نہیں جو کہ اس کا حق تھا۔ مرد اسے آج تک اپنی تنہائی دور کرنے کا ذریعہ سمجھتا آرہا ہے اور بس!

شاید یہی وجہ ہے کہ عورت ہر جگہ معتوب ہو رہی ہے کہیں اس سے پابرہنہ رقص کروایا جارہا ہے کہیں جبراً کوٹھے کی زینت بنادیا جاتا ہے۔ کبھی اسے زندہ جلانے کی کوشش ہوتی ہے تو کبھی طلاق کے تین پتھر مار کر اسے سنگسار کیا جاتا ہے۔ ہمارے اردگرد عورت کے لئے کتنی صلیبیں نصب ہیں؟ کیا مصلوب ہونا ہی عورت کا مقدر ہے؟ میں جب

بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے باہر نکلی اپنا وجود لہولہان کر بیٹھی۔ ہاتھ میں قلم سنبھالنے کے بعد سے میں اس سوال کے حصار سے کبھی باہر نہ نکل سکی اور جواب و جستجو میں کبھی غزلوں، کبھی افسانوں، کبھی ناولوں کی صورت حرف حرف کاغذ پر بکھرتی رہی، روشنائی کی طرح۔

یہ اور بات اس سے تعارف نہ ہو سکا
ہم زندگی کے ساتھ بہت دور تک گئے

آپ بیتی لکھنا بھی ایک فن ہے اور اس کا احساس اب تک شائع ہونے والی چند خوبصورت آپ بیتیوں کو پڑھ کر ہوا۔ میرے کچھ خیر خواہوں نے کئی بار مجھ سے پوچھا۔ میں اپنی آپ بیتی کیوں لکھ رہی ہوں؟ میں انہیں کیا جواب دیتی، کیسے سمجھاتی کہ۔ ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' کے ذریعہ میں نے اپنی بازیافت کی ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سوال بھی کیا کہ کیا ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' بے باک ہوگی؟ اس بے باکی سے ان کی اصل مراد کیا ہے یہ تو میں سمجھ نہ پائی۔ تاہم انہیں یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش ضرور کی کہ قلمکار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے سچا ہونا چاہئے یعنی وہ جو کچھ دیکھے، سمجھے یا جن تجربات سے گزرے، اس کا سچ سچ اظہار کر دے کیوں کہ ہر تخلیق فرد اور سماج کا آئینہ ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر فنکار خود اپنے بارے میں لکھتا ہے تو کیا اسے سچائی سے فرار حاصل کر لینا چاہیئے؟ سچائی کے بطن سے ہی بے باکی کا جنم ہوتا ہے اس لئے اگر یہ شرط ٹھہری کہ فنکار کو سچا اور بے باک ہونا چاہیئے تو اس کی آپ بیتی (خود نوشت) بھی بے باک ہونی چاہیئے۔ سچائی کے اس امتحان میں اسے تب ہی کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے جب وہ اپنے بارے میں بھی سچ لکھے۔

براج کومل ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ خود نوشت سوانح مصنف چونکہ اپنی زندگی کے اعترافات کے طور پر خود لکھتا ہے اس لیے اس کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی ذات، اپنی زندگی کے واقعات و حالات اور اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں، اپنی جذباتی وابستگیوں، جذباتی منافقتوں، روحانی وجودی مسئلوں کا ذکر پوری تفصیل اور پوری سچائی کے ساتھ کرنا چاہتا ہے تو اسے اس قسم کا رویہ اپنانا پڑتا ہے جس انداز کا رویہ روسو

یا سنٹ آگسٹائن نے اپنے "اعترافات" میں اختیار کیا یا پھر ہمارے عہد میں ایزاڈورڈ نکن نے "مائی لائف" میں اور کزنتزاکی نے "رپورٹ ٹوگریکو" میں کیا۔

اپنی "آپ بیتی" لکھتے وقت میں نے اسی رویہ کو پیش نظر رکھا ہے ہو سکتا ہے بعض باتوں پر کچھ لوگ مجھے برا بھلا کہیں اور فحش نگاری کا الزام لگادیں لیکن میں مطمئن ہوں۔ کہ میں نے جو کچھ دیکھا، سنا یا مجھ پر گزرا وہی لکھا۔ سچائی لکھ دینے سے لفظوں کی حرمت پر آنچ نہیں آتی۔

پھر بھی ان حضرات سے معذرت چاہتی ہوں جو آئینہ دیکھنے سے کتراتے ہیں۔

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" لکھنے کی تحریک مجھے امرتا پریتم کی آپ بیتی "رسیدی ٹکٹ" سے ملی۔ میں ابتداء میں عرض کر چکی ہوں کہ آپ بیتی لکھنا بھی ایک فن ہے اور مجھے اپنی کوتاہ علمی کا احساس ہے۔ پھر بھی یہ عرض کرنے کی جسارت ضرور کروں گی کہ میری آپ بیتی میں تنہا میرا ہی نہیں ایسے بے شمار کرداروں کا احوال ہے جن کی خوشیاں اور غم مشترک ہیں۔ میری زندگی کے شانہ بہ شانہ آپ کو کئی زندگیاں دکھائی دیں گی جو میرا ہی عکس نظر آتی ہیں۔ یہ وہی کردار ہیں جن سے برابر میرا واسطہ رہا۔

کچھ لوگوں کو یہ شکوہ ہو سکتا ہے کہ اس آپ بیتی میں عورتوں کی بے بسی اور بے چارگی کو پیش کر کے انہیں مظلوم اور مرد کو ظالم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایسا ہر گز نہیں ہے۔ جو عظیم ہیں ان کی عظمت کو سراہا گیا ہے جس کا ثبوت ثروت بیگم کے واقعہ میں عباس کا کردار ہے۔

میرے ساتھ جو واقعات رونما ہوئے جن اچھے برے تجربوں سے دوچار ہوئی اور زندگی کے سفر میں جس طرح کے مشاہدے ہوئے میں نے انہیں مقدور بھر تسلسل اور پوری دیانت داری کے ساتھ کاغذ پر اتار دیا ہے۔ "جنت سے نکالی ہوئی حوا" ہمارے معاشرے کی ایک زندہ تصویر ہے جسے پڑھ کر آپ کچھ سوچنے پر مجبور ہوں گے۔

فرشتے مبتلائے آزمائش ہوں تو چیخ اٹھیں
یہ انساں ہے جو دیتا جا رہا ہے امتحاں اپنا

"جنت سے نکالی ہوئی حوا" کے بعض زندہ کرداروں سے میں شرمندہ ہوں کہ میں نے ان کی زندگی کے بعض مخفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے لیکن ایک فن کار کے ناطے مجبور تھی۔ اجاگر نہ کرنے کی صورت میں فنکارانہ سچائی مجروح ہو جاتی۔ اپنی داستان میں میں نے کچھ چھپایا نہیں ہے۔ میں نے ہر کسی کا حساب بے باق کر دیا ہے۔ سود سمیت۔ مگر پھر بھی۔

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو
داغ اپنے پاس رکھے ، روشنی بانٹا کیے

نفیس بانو شمع

P O BOX No. 9734
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025
RING . 6842494

کارزارِ دنیا میں

خالق ارض وسماء نے لفظ کُن کہا اور اس کائنات کی تشکیل ہو گئی۔ میں اسی لفظ کُن کے درمیانی وقفہ کا ایک حقیر لمحہ ہوں۔

یوں تو ہر بچہ کی پیدائش والدین کے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہے، مگر ہمارے بزرگوں نے بتایا کہ میں جب پیدا ہوئی تو بڑے انوکھے انداز میں خوشیاں منائی گئیں۔ غازی پور (یوپی) کے اس چھوٹے سے قصبہ "بھتری" کو رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ کیا گیا۔ قرآن خوانی، میلاد، قوالی، پھر میرے سر سے چاندی کا صدقہ اتارا گیا۔ مجھے روپہلے سکوں میں تولا گیا۔ اور تین روز تک غریبوں، محتاجوں کو کھانے تقسیم ہوتے رہے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ بڑی منت اور مرادوں کے بعد میں نے دنیا میں قدم رکھا تھا۔

میرے دادا چالیس گاؤں کے زمیندار تھے (حالانکہ اب زمینداری ختم ہو چکی تھی۔ مگر ان کی آن بان وہی تھی) نوابوں کا سا رہن سہن لیکن انتہائی فراخ دل، سخی، غریب پرور، اور اپنے نام کی طرح فیاض بھی تھے۔ کہنے کو سب کچھ تھا۔ بڑی سی حویلی، درجنوں ملازمین، لاکھوں کی جائداد، کھیت، باغ، تالاب، دولت کی فراوانی ہو تو آسائشیں اور آسودگیاں خود بخود فراہم ہو جاتی ہیں، مگر یہ بھی سچ ہے کہ دولت سے کسی بھی دور میں خوشیاں نہیں خریدی گئیں۔ شاید اسی لیے ہزاروں غریبوں کی کفالت کرنے والے میرے دادا خود کو بے حد نادار سمجھتے تھے۔ ان کو یہی غم تھا کہ ان کا ایک ہی بیٹا اور شادی کے برسوں

بعد تک اولاد سے محروم ہے۔

اور آج جب کہ ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی تھی تو جشن ولادت کا غیر معمولی اہتمام ان کا فطری حق تھا۔ یا شاید انہیں کہیں سے علم ہو گیا تھا کہ یہ جشن بہاراں، جشن خزاں بن کر ہر سال اپنی تاریخ دہراتا رہے گا۔ اسی لیے میرے مقدر کی میرے حصے کی تمام خوشیاں بس اسی دن منالی گئی تھیں...!!

ہجر کا پہلا قدم

میں جب چار سال کی تھی۔

دادا اس دنیا سے سدھار گئے۔ کوئی چھ ماہ بعد دادی حضور بھی اپنے رفیق حیات سے جا ملیں۔ ابھی سوگواروں کے زخم مندمل بھی نہ ہوئے تھے کہ ہمارے جنت جیسے گھر کو آگ لگ گئی۔

میرے والد جو کہ ایک فوجی افسر تھے۔ سید گھرانے کا وقار اور اپنے بزرگوں کا اعتماد تھے، بیوی اور تین معصوم بچوں کے سرپرست تھے، وہ گاؤں کی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ سارا خاندان، ساری نصیحتیں، تمام دھمکیاں ایک طرف اور ان کا فیصلہ ایک طرف۔

آدم نے گندم کھایا تو جنت سے نکال دیئے گئے۔ مگر اس بار آدم نے خطا کی تو اس کی سزا صرف حوا کو ملی، وہ جنت سے نکال دی گئی۔

محبوبہ کی شرط تھی کہ بیوی کو چھوڑ دو، اور پھر تین طلاق کے ساتھ تین بچے سوغات میں دے کر حوا پھر بربادی کی گہری کھائی میں پھینک دی گئی۔ میں اس وقت چار سال کی تھی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی، اس سے چھوٹی بہن، ہماری والدہ کا میکہ، ہمارا ننہال ہی اب ہمارا مستقل ٹھکانہ تھا۔ وہی ہمارا گھر تھا۔

اس گھر میں سب کچھ تھا، محبت، شفقت، اپنائیت، اپنے نانا کی پہلی نواسی ہونے

کے ناطے، میں ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ نانی کے دل کا سکون، اور ماموں، ممانی کے سونے آنگن کی رونق، چونکہ میرے ماموں لاولد تھے اس لیے انہیں بچوں سے قدرتی لگاؤ تھا۔ گھر کا ہر فرد ہماری دلجوئی میں لگا رہتا۔ ہمارے اسکول بیگ میں کتابیں کم، ٹافیاں زیادہ ہوتیں۔ تین کوس دور گاؤں میں سالانہ میلہ لگتا تو نانا مجھے اپنے کاندھوں پر بٹھا کر میلہ دکھانے لے جاتے، کیوں کہ اس زمانہ میں موٹر یا رکشہ کا رواج نہیں تھا۔ سواری کے لئے بیل گاڑی یا جو شرفاء کی خواتین ہوتیں ان کے لئے ڈولی کا انتظام تھا اس کے علاوہ یکہ اور تانگا ہوا کرتا۔

ہم جہاں جہاں سے گزرتے بڑے پر پیچ راستے ہوا کرتے تھے۔ گھنے جنگلات، بنجر علاقے، چھوٹی بڑی کئی ندیوں اور نہروں سے گزر کر وہ مقام آتا جہاں میلہ لگتا تھا۔ چونکہ ندی، تالاب اور نہروں سے والہانہ لگاؤ مجھے بچپن سے ہی تھا، جب بھی کوئی ندی پڑتی، میں تانگے یا پھر نانا کے کاندھے سے اترنے کی ضد کرتی، میری یہ ضد پوری کی جاتی۔ ندی کے ایک کنارے پر کھڑی ہو کر دور تک پھیلے صاف و شفاف پانی کو بڑے انہماک سے دیکھتی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے پانی اٹھا کر سطح پر اچھال دیتی۔ اور من ہی من میں مسکراتی، اس مسکراہٹ کا مطلب کون جانتا تھا؟ میرے نانا؟ یا میرا بچپن؟ نہیں!! صرف وہ ندی جسے پتہ تھا کہ میری آئندہ تمام زندگی ساحل کے پاس رہ کر تشنہ لب گزرے گی۔

میں اپنے نانا کی اتنی چہیتی تھی کہ میلے میں جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی، چاہے وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو یا غیر ضروری، نانا اسے ضرور خریدتے۔ گھر کا کونہ کونہ طرح طرح کے کھلونوں سے بھرا تھا۔ مجھے گھروندے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ کچے آنگن کے ہر گوشے میں ایک خوبصورت گھروندا نظر آتا۔ توری کے پتوں کے عرق سے چھپتے ہوئے گھروندوں میں ننھی ننھی سی کپڑے کی گڑیاں ہوتیں۔ گڑیوں سے کھیلنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گڑیوں کی شادیاں بھی بڑے دھوم دھام سے کرتی۔ دن بھر گڑیوں کے ساتھ رہتی، رات کو ان کا خواب لے کر سو جاتی۔ دل بہلنے کے بہت سے ذرائع گھر

میں موجود تھے مگر نہ جانے وہ کون سی کمی تھی، کون سا ان دیکھا غم تھا جو آنکھوں کو اکثر آنسو دے جاتا۔ نانا پریشان ہو اٹھتے۔

"میری بچی! کسی نے تمھیں کچھ کہا، نانی نے ڈانٹا، اماں نے مارا؟" اور میں اپنے آنسو پونچھتے ہوئے صرف اتنا کہتی "ابا" نانا مجھے گود میں اٹھا کر گلے سے لگا لیتے اور کہتے۔ "میں ہوں نا، تم کیوں روتی ہو؟" حالانکہ والد سے نہ مجھے شفقت اور محبت ملی تھی نہ زیادہ ساتھ رہا تھا مگر بقول نانی محترمہ کے "یہ خون کی کشش تھی قدرتی لگاؤ تھا، ایک روحانی رشتہ تھا جس سے دور رہ کر محرومیت کے احساس میں گھل رہی تھی۔"

جب میں پانچ سال کی ہوئی تو۔

ایک ساتھی اور بچھڑ گیا، میرا بھائی منا، جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ گلاب کی طرح تر و تازہ، شاداب، ہنستا، مسکراتا، ایک روز کے بخار میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اماں کے لئے یہ صدمہ عظیم تھا، جسے انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے جھیلا، اور میں رات دن روتی رہتی، اپنے بھائی کو کھیتوں، باغوں، کھلیانوں اور کھنڈرات میں تلاش کرتی، جہاں جہاں وہ میرے ساتھ کھیلا کرتا تھا، جب اماں اس کے پہنے ہوئے کپڑوں اور کھلونوں کو سینے سے لگا کر روتیں تو میں بھی ان سے لپٹ کر دیر تک سسکتی رہتی۔ جب میں رو رو کر ضد کرتی کہ منا کو ڈھونڈ کر لاؤ تو نانی مجھے سمجھاتیں۔

"بیٹا منا اب کبھی نہیں آئے گا"۔

میں پوچھتی آخر کیوں؟ جواب ملتا کہ منا اب وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

"میں بھی وہیں جاؤں گی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا"۔

اور میری نانی میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے سینے سے لگا لیتیں۔ اور پھر مجھے صبر آ گیا۔ گڑیوں کے خاندان میں اپنے غم بانٹ لیے۔ گڑیوں کے ایک بچے کا نام منا رکھا اور منا سے تنہائی میں گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ یوں تو کئی گڑیوں سے میری لڑائی اور کئی سے دوستی بھی تھی۔ آسیہ، زیبا، رابعہ، شمع، گڑیوں میں یہ میری بہترین سہیلیاں تھیں۔ میں اپنے دل

کی ہر بات ان سے کہتی۔

زندگی کے ایک موڑ پر انہیں ناموں کی خواتین سے حقیقت میں میری دوستی بھی رہی، جو سچ مچ میری ہمدرد، غمگسار ثابت ہوئیں۔ اسے اتفاق کہیں یا میرے ظاہر کا وہ کھیل جسے میرا باطن ترتیب دے رہا تھا۔ شاید اسے آنے والے دنوں کا علم تھا۔ انہیں دنوں ایک اور ساتھی کے بچھڑنے کا اعلان کر دیا گیا۔

آج میری والدہ کا دوسرا نکاح تھا۔ سید گھرانے کی آبرو جونپور شہر کے ایک اسکول ماسٹر کے حوالہ کر دی گئی۔ اماں چلی گئیں۔ اپنی نئی زندگی اور نیا گھر بسانے اور ہم اپنی نانی کے کندھے سے لگے روتے بلکتے رہ گئے۔

میں بجھ سی گئی۔ باری باری سب کی یاد تڑپاتی، ابا، منا، اماں! سوچتی آخر یہ کیسے رشتے ہیں، ایک ننھی سی بچی کو چھوڑ کر سب کیوں چلے جاتے ہیں؟ ہزاروں لاکھوں سوال تھے جو میرے ذہن میں اٹھتے مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ چھوٹی بہن انجم کو والدہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ کیوں کہ ایک ہی بچی کو ساتھ رکھنے کا سوتیلے باپ سے معاہدہ تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی گڑیا سے لپٹ کر روتی اور پوچھتی، تم تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی نا؟ وقت اور حالات نے مجھے بہت حساس بنا دیا تھا۔

اب میں زیادہ تر خاموش رہتی۔ بچوں کے ساتھ باہر کھیلنے بہت کم جاتی اسکول میں دل نہ لگتا جب کھیل کھیل میں میرے ہم عمر ساتھی قہقہہ لگا کر ہنستے تو اس وقت میں صرف مسکرا دیتی۔ یوں لگتا یہ مسکراہٹ بھی مری ذات پر میرا احسان ہے۔!

ماں سال چھ مہینے میں کبھی کبھار شہر سے گاؤں آتیں۔ مہمانوں کی طرح رہتیں۔ ماں جب تک رہتیں، میں انہیں کے ساتھ ان سے لپٹ کر سوتی، مگر کچھ عرصہ بعد یہ حق بھی مجھ سے چھن گیا۔ میری جگہ ایک ننھی منی سی بچی نے لے لی تھی۔ وہ دنیا میں ابھی نئی نئی آئی تھی نا؟

ماں اس کے بنا کروٹ بھی نہیں بدلتی تھیں۔ (برسوں بعد آج بھی یہ روایت قائم ہے) بہر حال! کچھ دنوں رہ کر جب اماں شہر واپس جاتیں تو میرے تازہ زخم پھر سے

ہرے ہو جاتے میں انہیں وقتِ رخصت دور تک دیکھتی۔ میری بہن انجم پلٹ پلٹ کر بار بار مجھے دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو۔ "تم بھی میرے ساتھ چلونا؟" اسے کیا معلوم کہ والدین کی شفقت، ان کا قرب، ان کا ساتھ نصیب والوں کو ملتا ہے۔ اور میں تو نصیب میں ہر رشتہ سے جدائی کا خانہ لکھوا کر لائی تھی۔

سوچوں کا عذاب مسلط ہوا تو ہمارے گھر کے آس پاس کے کھنڈرات آباد ہو گئے۔ وہ گھر، وہ شکستہ عمارتیں جو برسوں سے ویران پڑی تھیں جن کے دروں پر ابابیل نے مٹی کے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ جن میں چمگادڑ، سانپ اور شہد کی مکھی سے لے کر گائے، بھینس اور بکریاں اور کتے تک نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا اور جہاں کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ ان میں بدروحوں کا سایہ ہے۔ وہی مقام اب میرے لیے جائے پناہ تھا۔ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر انہیں کھنڈرات میں وقت گزارتی۔ گھنٹوں سوچتی، وہاں کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا۔ رونے کی وجہ پوچھنے والا نہیں تھا۔ دامن بھی اپنا تھا اور آنسو بھی اپنے۔!!

جب موت واپس لوٹ گئی

کبھی کبھی موت اتنے قریب سے ہو کر گزر جاتی ہے کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ یہ 1961 کی بات ہے جب ہم اپنے خاندان کے چند افراد کے ساتھ جن میں میری نانی محترمہ خالہ اور ممانی بھی تھیں۔ ایک بزرگ کے سالانہ عرس میں شرکت کے لئے ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ کسی نے چین کھینچ دی۔ ٹرین کی رفتار کم دیکھ کر میری نانی جو دیہات کی سیدھی سادی، سادہ لوح خاتون تھیں سمجھیں کہ اسٹیشن آگیا ہے۔ وہ مجھے گود میں لے کر اترنے لگیں۔ دفعتاً ان کا پیر پھسلا میں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹرین کے نیچے جا پڑی۔ لوگوں نے سمجھا کہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکی ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب ٹرین کی حرکت بند ہوئی تو ایک ہجوم نے دیکھا کہ ٹرین کے پہیئے سے میری گردن کا فاصلہ صرف چند انچوں کا تھا۔ قدرت کے اس کرشمہ پر سب محو حیرت تھے مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چند انچوں پر کھڑی موت نے لوح محفوظ پر دیکھ لیا تھا کہ میری موت قسطوں میں لکھی ہوئی ہے۔ میں بڑی سخت جان ہوں، ایک بار کی موت میرے لیے کافی نہ ہوگی۔

اس حادثہ کو زمانہ گزر چکا ہے مگر محسوس ہوتا ہے، میں اب بھی ٹرین کی لائن پر خوف زدہ سہمی ہوئی پڑی ہوں اور بے شمار ٹرینیں مجھ پر سے گزرتی ہیں اور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی ہوں۔ میرا یہ ٹوٹنا بکھرنا، دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ دراصل یہاں سب

مسافر ہیں۔ اپنے اپنے سفر کے نشے میں گم۔ سب کو اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کی دھن ہے۔ انہیں تو ٹرین کی تیز رفتاری سے دل چسپی ہے چاہے وہ کسی کی گردن پر سے گزرے یا جسم کے ریزے ریزے کرے۔ آج بھی جب کوئی ٹرین قریب سے گزرتی ہے تو مجھ سے چند فاصلہ پر کھڑی موت مسکرا کر میرا چہرا دیکھتی ہے۔ !

جب ہم نے کچھ خواب سجائے

اب میں گیارہ سال کی تھی۔

گھر میں ہر وقت سنجیدہ ماحول رہتا، نانا زیادہ تر کھیتوں، کھلیانوں اور باغوں کی دیکھ بھال اور نگرانی میں مصروف رہتے۔ نانی جو اپنی عمر کی زیادتی کے باعث کمر سے جھک گئی تھیں، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت یہی دعا کرتیں "پروردگار، مجھے چلتے بازو اٹھا لینا، کسی کا محتاج نہ بنانا"۔ ایک ہی ماموں تھے وہ بھی لاولد۔ گھر میں نہ چھوٹے بچوں کی کلکاریاں تھیں نہ معصوم شرارتیں، نہ شور نہ ہنگامے، ہزار گز میں تعمیر شدہ یہ مکان کوئی جن خانہ لگتا تھا۔ نانی کو ہر وقت یہی دکھ رہتا کہ ان کا اکلوتا بیٹا لاولد ہے۔ نانی بیٹے کو اکثر سمجھاتیں، ممتا کے واسطے دیتیں کہ دوسری شادی کر لو تاکہ آئندہ بھی ہمارے خاندان کا چراغ روشن رہے۔ مگر ماموں پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ چٹان کی طرح اٹل تھے۔ حالاں کہ وہ اپنی میڈیکل رپورٹ سے مطمئن تھے مگر وہ کہتے تھے کہ دوسری شادی کر کے بیوی کو دکھ پہونچانا نہیں چاہتے۔ ماموں کی یہ باتیں سن کر میں سرد آہیں بھرتی۔ کاش! میرے ابا نے بھی یہی سوچا ہوتا۔ ہمیشہ اپنے دل میں ماموں کی عظمت کو سراہتی۔ محبت میں ان کی یہ قربانی آج تک ہمارے خاندان میں مثال کی طرح دہرائی جاتی ہے۔

ممانی کی خواہش پر انہوں نے ایک بچہ کو گود لے لیا تھا۔ ہاں ایک بچہ جس کے بارے میں وہ خود بھی نہ جانتے تھے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ میرے ماموں ایک

مقامی اسکول کے پرنسپل تھے۔ ایک روز چند شاگرد ایک تین چار سالہ بچہ کو لے کر ماموں کے پاس آئے اور کہا کہ۔ سر! یہ اسٹیشن پر کھڑا رو رہا تھا (اسٹیشن اسکول سے بالکل قریب تھا) ہم اسے لے آئے ہیں۔ ماموں بچہ کو گھر لے آئے۔ اس کے جسم پر ایک پھٹا ہوا بنیان اور ایک پھٹا سا پاجامہ تھا۔ ختنہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، بارہا پوچھنے پر بھی اس نے اپنا نام بتایا نہ پتہ۔

ماموں نے اپنی مقدور بھر کوشش کر لی کہ اس کے وارث اسے آکر لے جائیں۔ اخبار، ریڈیو، جتنے بھی ذرائع تھے استعمال کر لیے مگر اس کا دعویدار کوئی نہ تھا۔ آخر کار ماموں نے اسے گود لے لیا۔ ممانی کے سونے آنگن میں بہار آگئی۔ اس کا نام اسدم رکھا گیا۔ میرے نانا نے بھی اسے وہی چاہت دی جو ایک پوتے کو دے سکتے تھے۔ میں اس گھر میں سب کی محبتوں کی تنہا حقدار تھی مگر اب میرا ایک شریک اور آگیا تھا۔ میں اس کا لاڈ پیار دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلا۔ دھیرے دھیرے ہم میں صلح ہو گئی۔ اب میں اسے اپنے بھائی سے کم عزیز نہ رکھتی تھی۔ ہمارے مزاجوں میں یکسانیت تھی اور سوچنے کا انداز بھی ایک جیسا۔ قسمتیں بھی تقریباً ایک جیسی تھیں، وہ بھی اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا اور میں بھی، فرق اتنا تھا کہ اسے اپنا گھر اپنے والدین اپنا نام کچھ بھی یاد نہ تھا اور مجھے اتنا کچھ یاد تھا کہ ان کے عذاب میں جل رہی تھی۔

اسی سال خاندانی روایت کے مطابق ململ کا چادر نماز دوپٹہ دے کر میرا باہر نکلنا بند کر دیا گیا۔ ہمارے خاندان کی ہر لڑکی کو اس عمر میں پردہ کا حکم ہو جاتا تھا۔ مجھے پہلی بار گھٹن کا احساس ہوا۔ اب نہ کھنڈرات میں جانے کی اجازت تھی نہ جھیل کے کنارے نہ باغوں میں نہ کھیتوں میں۔ اسکول میں بھی برقعہ پہن کر جاتی۔ اب ہجولی لڑکوں کے ساتھ کھیلنا بھی ممنوع ہو گیا تھا ہم عمر لڑکیاں کسی گھر میں نہ تھیں اور تھیں بھی تو ہمارے طبقے کی نہ تھیں۔ دھوبی، بھنگی، پاسی، ڈوم، ان کے ساتھ دوستی یا میل جول سید گھرانے کی شان کے خلاف تھا۔ اب صرف میں تھی اور گھر کی چہار دیواری، گھر میں بوڑھے نانا کی کھانسی، نانی کی وہی زندگی سے ہار ماننے والی باتیں ممانی نے قرآن پاک، جائے نماز اور تسبیح سنبھال رکھا تھا۔

لے دے کر ایک ملازمہ تھی باتیں تو وہ خوب کرتی تھی لیکن قوت سماعت کمزور تھی۔ اپنی سنا لیتی دوسروں کی نہیں سن سکتی تھی۔ دل گھبراتا تو ایسا جی چاہتا کہ آنگن کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک قبر کھود کر اس میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔ چراغ بجھتے بجھتے پھر جل اٹھا۔ انہیں دنوں اماں کے ماموں زاد بھائی کی فیملی شہر سے گاؤں میں شفٹ ہوئی تھی۔ میرے ماموں کا گھر ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا ان کی بیٹی فاطمہ جو میری ہم عمر تھی بہت جلد مجھ سے گھل مل گئی اور میری ایک بہترین دوست بن گئی۔ یہ شہری اور دیہاتی مزاجوں کا ایک نادر سنگم تھا۔ ہمارے معصوم ذہنوں نے دوستی کا جو رشتہ قائم کیا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ پائیدار ہوتا گیا۔

مجھے پہلی بار یقین ہوا کہ دوست سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ دوستی سے اعلیٰ اور عظیم کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ میں اور فاطمہ چپکے سے گھر والوں کی نظر بچا کر باہر نکل جاتے۔ کبھی آم کے باغ میں پوری دوپہر گزرتی، کبھی گنّے کے کھیت کے کنارے گھنٹوں گنّے کھائے جاتے اور ساتھ ہی پریوں، شہزادیوں اور جنوں کی کہانیاں سنائی جاتیں۔ محویت اس وقت ٹوٹتی جب سامنے سے نانا ہاتھ میں اپنی مخصوص چھڑی گھماتے ہوئے نظر آتے۔ غصہ میں تمتمائے ہوئے ہم بھاگتے، گھر پہنچنے پر ہماری خوب پٹائی بھی ہوتی مگر پھر بھی باہر کی سیر سے باز نہ آتے۔ کبھی مچھلی پکڑنے کا شوق ہوتا تو تالاب کے کنارے تھوڑے پانی میں کھڑے ہو کر اپنے دوپٹہ کو جال بنا کر پانی چھان لیتے۔ کئی بار کے اس عمل سے کثیر تعداد میں مچھلیاں جمع کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بڑی مچھلی دوپٹہ میں آجاتی تو خوف کے مارے اسے پانی میں واپس پھینک دیتے۔ گھر میں آکر مچھلیوں کو آگ میں بھونتے پھر نمک لگا کر کھاتے۔ بہت مزہ آتا۔

گھر وہی تھا گاؤں کے راستے بھی وہی تھے مگر ایک دوست ایک ساتھی کے ملنے سے زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ اب میں نے خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ ہاں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب تنہائی میں گڑیوں سے بات کرنا کم ہو گیا تھا۔ نہ جانے میں سنجیدہ ہو گئی تھی یا میری گڑیا؟

فاطمہ بہت ہنس مکھ ملنسار اور ایثار والی لڑکی تھی۔ بہت ساری خوبیوں کے ساتھ اس میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کی آواز بہت اچھی تھی۔ دلکش اور پر سوز، اس کے ترنم میں بلا کا جادو تھا۔ میری فرمائش پر وہ کوئی فلمی نغمہ سناتی تو میں اس کی آواز کے سحر میں کھو جاتی۔ مجھے یاد ہے، میں اس سے ہمیشہ ایک ہی گانے کی فرمائش کرتی۔

"ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے
ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے"

وہ گاتی اور میں جانے کس دنیا میں کھو جاتی۔ ایک دن اتفاق سے نانی نے یہ گانا سنتے ہوئے مجھے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ گھر میں ایک ہنگامہ، خوب ڈانٹ پڑی دونوں پر، اور یہ بے خودی میں پکارنے کی کڑی جانے کس کڑی سے جوڑ دی گئی۔ ہم بچے تھے۔ ہمارے ذہن کی وہاں تک رسائی بھی نہ تھی۔

جسے ابھی ٹھیک طرح سے دوپٹہ اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ آیا تھا اب اس کے رشتوں کے انبار لگ گئے۔ میں نانی سے لپٹ کر بہت روئی۔ نانی! یہ لوگ مجھے دیکھنے کیوں آتے ہیں؟ میں ابھی چھوٹی ہوں، ابھی تو مجھے اپنی ساری گڑیوں کا بیاہ کرنا ہے۔ آپ لوگ میری شادی کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ میں نے کئی روز کھانا نہیں کھایا، روتی رہی، میں بچی تھی مجبور تھی وہ ہمارے بزرگ تھے اور مختار تھے۔ میرا رشتہ گیارہ سال کی عمر میں لکھنؤ کے ایک پچیس سالہ نوجوان سے کر دیا گیا۔ جب منگنی کی رسم ہوئی تو لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ ہائے اللہ لڑکی اتنی چھوٹی اور لڑکا اتنا بڑا؟ مگر یہاں بات چھوٹے اور بڑے کی نہیں تھی۔ بات تھی ایک سہارے کی اور بوجھ ہلکا کرنے کی۔ بغیر ماں باپ کی بچی جب جوانی کی طرف بڑھنے لگے تو اس کے وارثوں کا فکر مند ہونا فطری ہے۔ اور پھر ہمارے گاؤں دیہاتوں میں چھوٹی عمر میں لڑکیوں کو بیاہ دینا بڑی عقلمندی اور دور اندیشی سمجھی جاتی ہے۔ یہ روایت جانے کب سے قائم ہے؟ کمسن لڑکیوں کو ادھیڑ عمر کے مردوں سے منسوب کر دینا بھی عام روش ہے۔ ان کے پاس دلیلیں ہوتی ہیں کہ ہمارے حضور ﷺ 60 سال کی عمر میں 9 سالہ حضرت عائشہؓ کو بیاہ کر لائے تھے۔ مگر کوئی چالیس سالہ بیوہ خاتون کسی پچیس سال کے کنوارے یا دوہاجو

نوجوان سے نکاح کرنا چاہے تو ہمارے سماج میں اسے بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ اور حضور ﷺ کے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کی تاریخ احادیث کے اوراق سے باہر نہیں دی جاتی۔ اس سنت پر عمل کرنا تو دور کی بات ان کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حج وغیرہ کے موضوع پر اکثر آڈیو ویڈیو کیسٹیں تیار کی جاتی ہیں ان میں ہمارے علماء اس ذکر خاص کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی رو سے وہی بات کہی جاتی ہے، جس میں صرف اپنا فائدہ ہو۔ اپنی دکان سجے، اپنا کاروبار چلے۔

ہاں تو ذکر منگنی کا تھا۔ لڑکپن کو زبردستی دھکیل کر سنجیدگی کی راہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ مجھ جیسی حساس لڑکی ایک بار پھر بجھ گئی۔ اب تصور میں ہر وقت ایک لمبا چوڑا شخص قصائی کی طرح میرا تعاقب کرتا ہوا نظر آتا۔ میں خوف زدہ سہمی ہوئی اس کے خیالوں سے چھٹکارا پانا چاہتی۔

شاید قدرت کو رحم آ گیا اور وہ دن میری بے انتہا خوشی کا دن تھا جب لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک خط نے ایک نئے حادثے کا انکشاف کیا۔ امجد نے گھر والوں سے بغاوت کر کے اپنی پسند کی لڑکی سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ منگنی ٹوٹ گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حالانکہ گھر والے بہت رنجیدہ تھے مگر مجھے اپنے ارد گرد کا ماحول کشادہ اور پر سکون لگنے لگا۔ سینے میں اب کسی گھٹن کا احساس نہ تھا!

ٹوٹی کہاں کمند

عمر کی تیرہویں منزل پر قدم رکھتے ہی ایک بار پھر سینی میں مٹھائیاں، بنارسی جوڑے، عطریات اور پھول سجا کر مجھے چونکا دیا گیا۔ آج میری منگنی کی رسم تھی۔ چھ سات ماہ کی مسلسل چھان بین کے بعد گھر والوں کو ہڈی بوٹی کی طرف سے اطمینان ہوا تھا۔ لڑکا جبل پور میں کسی سرکاری عہدہ پر فائز تھا۔ آبائی گھر غازی پور شہر میں تھا۔ لڑکے کے والد اور اس کی بڑی بھابھی یہ رسم ادا کرنے آئے تھے۔ ہمارے گھر والوں نے لڑکے کی تصویر دیکھ کر اسی پر اکتفا کر لیا تھا۔ خاندان اچھا تھا والدین شریف اور سید تھے۔ آج کی رات پھر میں نے رو رو کر تکیہ بھگو لیا تھا۔ صبح اٹھی تو لگا جیسے گھر کے در و دیوار، آنگن میں امرود اور بیری کے درخت سب جھوم جھوم کر مبارکباد دے رہے ہوں، اور گھر کی ہر شئے مجھے الوداعی نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ عجیب کیفیت میں مبتلا تھی۔ کبھی میرے سامنے میرے رشتے کی خالہ نفیسہ آ جاتیں جن کا سراپا دیکھ کر لرز جایا کرتی تھی۔ بال بکھرائے ہوئے، پھٹی پھٹی سی وحشت زدہ آنکھیں، ہونٹوں پر بے معنی قہقہے، گلی کے شریر بچے اکثر ان کو پاگل کہہ کر ستاتے، پتھر پھینکتے، بچپن سے اب تک یہی منظر دیکھتی آئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کے شوہر اور سسرال والوں نے ان کی یہ حالت بنائی ہے۔ وہ ایام زچگی میں تھیں کہ سسرال والوں نے ان سے ان کا پہلا اور نومولود بچہ چھین لیا۔ بچے کی جدائی کا غم تھا ہی، کہ انہیں دنوں جب یہ معلوم ہوا کہ بچہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تو یہ خبر سنتے ہی وہ دماغی توازن کھو

بیٹھیں۔ پورے خاندان میں وہ اپنے بے پناہ حسن و جمال اخلاق و کردار اور خوش خلقی میں مشہور اور ایک مثال تھیں۔

اور آج جوان کا روپ تھا وہ ہمارے لئے عبرت کا مقام تھا۔ لوگ کہتے ہیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مگر جب میرے تصور میں باری باری وہ تمام لڑکیاں، عورتیں جو کسی نہ کسی حالت میں شوہر کے ظلم کا شکار تھیں، آتیں تو پانچوں انگلیاں ایک ہی سائز کی نظر آنے لگتیں۔ شاید اسی لئے اب شادی کا لفظ نفرت بن کر میرے دل میں سلگ رہا تھا۔

میں اس روز بھی مجبور و بے بس سی گم صم بیٹھی ہوئی تھی کہ میری خالہ زاد بہن حمیدہ نے آکر مجھے خبر سنائی کہ ہمارے گھر والوں نے اس رشتے کو منع کر دیا ہے۔ اور میں حیرت زدہ سی کھڑی اپنی بہن حمیدہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کیوں کہ وجہ خود اسے بھی معلوم نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی تھی مگر ہمارے یہاں چاہے 20 سال کی لڑکی ہو یا چار سال کی بچی شادی بیاہ کی گفتگو کے دوران انہیں درمیان سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح لڑکیوں سے ہر بات پوشیدہ رہتی ہے یہاں تک کہ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہو اسے اتنا بھی علم نہیں ہوتا کہ اس کا ہونے والا شوہر کس شکل و صورت کا ہے۔ وہ تو بس کھونٹے کی گائے ہوتی ہے جہاں چاہو باندھ دو۔

ہمارے بزرگ یہاں پر بھی حضور ﷺ کی اس حدیث کو صریحاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اسے دیکھ لو کہ ایسی صورت میں تمہارے درمیان میں موافقت پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے"۔ مغیرہ عورت کے والدین کے پاس پہنچے اور آپ کے ارشاد سے ان کو مطلع کر دیا۔ انہوں نے نامناسب خیال کیا۔ لیکن جب عورت نے اندر سے سنا تو کہا "اگر رسول ﷺ نے دیکھنے کو کہا ہے تو دیکھ لیجئے۔" مغیرہؓ کہتے ہیں یہ جواب سن کر میں نے اسے دیکھ لیا اور اس سے شادی کر لی۔

(احمد، ابن ماجہ، ترمذی، ابن حبان)

بہر حال! منگنی ٹوٹ گئی مگر یہ خلش ایک عرصہ دراز تک میرے دل میں رہی کہ

آخر ایسا کیوں ہوا؟

یہ راز تو برسوں بعد مجھ پر کھلا کہ منگنی والے دن لڑکے کی بھابھی نے یہ انکشاف کیا تھا کہ اس کا اپنے دیور سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات گھر کے کسی فرد سے خاموشی سے کہی گئی تھی مگر یہ گرم خبر جنگل کی آگ بن کر مردوں تک پہنچ گئی، پھر کیا تھا جہاں دیدہ بزرگوں نے ایک چاول سے پوری دیگ کا اندازہ کر لیا۔ بھابھی کا ایک جملہ میری رہائی کا باعث بن گیا۔!!

پہلی دستک

شامیں تو میری زندگی میں بہت آئی تھیں، مگر آج کی شام میں جو نکھار تھا، جو کشش تھی وہ پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ آج گھر کی ہر شئے مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ آنگن میں چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی پان کی گلوریاں بناتی ہوئی بڑی بوڑھی عورتیں، شور و غل مچاتے ہوئے ننھے ننھے بچے بھی پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ آنگن میں موتیا اور موگرے کے پھولوں کی مہک آج وجود کے جانے کس گوشے میں اتر رہی تھی۔ طاق میں رکھے ہوئے ننھے ننھے چراغوں کی تپش دل کو چھو چھو کر گزر جاتی۔ اس کیفیت کو میں کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ کیوں کہ سب کچھ نیا نیا تھا۔ فطرت نے مسکرا کر پھر وہی نغمہ چھیڑ دیا تھا۔

"ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے
ساغر میں زندگی کو اتارے چلے گئے"

یہ سچ ہے کہ اس شعر کی تشریح بن کر ایک چاند ہمارے گھر آیا تھا مگر منظر پر چاندنی ابھی ٹھیک طرح سے پھیلی بھی نہ تھی کہ وہ بادلوں میں روپوش ہو گیا۔ خاندان کی ایک تقریب میں یہ ہماری مختصر سی ملاقات تھی۔ جس میں کچھ کہا نہ سنا۔ بس ایک دوسرے کو شدت سے محسوس کیا اس کے جانے کے کچھ دن بعد تک دل اچاٹ رہا پھر سب کچھ معمول پر آ گیا۔ شاید اس کی بھی یہی کیفیت رہی ہو وہ جس یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، وہاں کی لڑکیاں بہت پر کشش شخصیت کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک سیدھی سادی دیہاتی لڑکی بھلا

کب تک اس کے ذہن میں رہی ہوگی۔ اس نے کبھی میرے نام کوئی خط بھی تو نہیں لکھا، جب میں اس کے بارے میں سوچتی، میری الجھنیں بڑھ جاتیں۔ وہ خواب میں بھی آتا تو اس کے ہمراہ کوئی شہری لڑکی ہوتی۔ اب مجھے اس کے خیال سے کوفت ہونے لگی تھی، ویسے بھی مردوں کے بارے میں میرے تاثرات اچھے نہ تھے۔ آخر کار میں جلد ہی اسے بھول گئی شاید اس وقت تک میں محبت کے مفہوم سے بھی لاعلم تھی۔

انیسؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں۔!!

یوں ہوئی ابتداء تباہی کی

چودہ سال کی عمر میں میرا یہ پہلا اہم خواب تھا جو اس رات دیکھا۔ تیز آندھیاں چل رہی ہیں اور میں گھبرا کر گھر سے باہر نکلی ہوں تو دیکھا، دروازہ پر ایک شخص کھڑا کہہ رہا ہے۔ "رکو! آگے مت جاؤ، اب تم باہر نہیں جاسکتیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں، آج سے ایک ماہ بعد تمہاری شادی ہونے والی ہے۔" گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔ صبح تک خواب کے بارے میں سوچتی رہی، ابھی تو رشتہ کا سلسلہ بھی کہیں نہیں چل رہا تھا۔ پھر ایک مہینے میں شادی کیسے ممکن تھی؟ مگر وہ جو تمام امور پر قادر ہے ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

خواب کے دوسرے ہی ہفتے شہر سے ایک رشتہ آیا۔ خاندان اچھا تھا، نواب فیملی سے تعلق رکھتے تھے، بنارس کے شرفاء اور معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا، سید گھرانہ تھا، لڑکا بمبئی میں باپ کا بزنس سنبھال رہا تھا۔ ہمارے بزرگوں کے نزدیک یہ مناسب رشتہ تھا جو فوری طے کر دیا گیا۔ شادی کی جو تاریخ مقرر ہوئی وہ میرے خواب کی تاریخ سے پورے ایک ماہ بعد کی تھی۔

اس بار منگنی ٹوٹنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں بہت روئی نانی سے لپٹ کر، گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر، مہندی اور امرود کے درختوں سے چمٹ چمٹ کر زار و زار روئی۔ جس گھر میں میرا پورا بچپن گزرا تھا۔ آج اس سے جدا ہونے کے تصور سے ہی دل کٹ رہا تھا۔ مگر آنسو قدرت کے فیصلے تو نہیں بدل سکتے؟

وہ گھڑی بھی آگئی جب میں دُلہن بنی!

اپنے خاندان میں، میں پہلی دُلہن تھی جس کے ہاتھ مہندی کے رنگوں سے خالی تھے۔ کیوں کہ اس روز مجھے تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر نے مہندی کی ٹھنڈ کو میرے لیے مضر بتایا تھا۔ مگر وہ جو سب سے بڑا طبیب ہے اپنی حکمت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ شادی میں میرے والد کو بھی مدعو کیا گیا تھا مگر وہ اس قدر تاخیر سے پہنچے کہ تمام اہم مواقع نکل چکے تھے روایت کے مطابق بیٹی کو سہرا باپ باندھتا ہے اور یہ کام میرے سوتیلے باپ نے کیا۔

سسرال میں تین روز تک مجھے روک لیا گیا۔ دن بھر مہمان خواتین کی آمد و رفت کا سلسلہ رہتا۔ رات آتی تو گھونگھٹ اٹھانے اور گرانے کی اذیت سے چھٹکارا ملتا۔ مجھے تنہا کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ میں کمسن سادہ لوح اور دیہاتی لڑکی تھی، دن بھر کی تھکن بستر پر ڈال کر صبح تک بے خبر سوتی، شادی کے بعد کی تمام فطری کارروائیوں سے لاعلم تھی۔ شاید اسی لیے ان تین دنوں میں ایک بار بھی میں نے یہ نہیں سوچا کہ دولہے میاں نے اب تک میرا چہرا کیوں نہیں دیکھا تھا؟

نہ مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب تیسرے دن پھر سے مجھے دُلہن بنا کر سجایا سنوارا گیا۔ کمرے کو پھولوں سے آراستہ کیا گیا اور دولہے میاں کو بھابھیوں نے کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی سر تا پا لرز گئی۔ میں خوف زدہ سہمی ہوئی سمٹی ہوئی اپنے ہی اندر کہیں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ گویا ہوئے۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔"

کوئی بجلی ٹوٹ کر آسمان سے گری۔

وہ کہہ رہے تھے۔!

میں سن رہی تھی۔!

ہر طرف طوفانوں کا شور تھا۔

میں نے دیکھا میرے سرخ لباس میں آگ لگ چکی تھی، پھولوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔

وہ کسی اور کا خواب تھے تو میری زندگی میں کیوں آئے شادی سے انکار کیوں نہیں کر دیا؟

وہ کہہ رہے تھے "مجھے مجبور کر دیا گیا"۔

اگلے روز میں اپنے میکے واپس آ گئی۔ میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا۔ میں نے گھر والوں کو بتا دیا تھا یہاں تک کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں اب تک ! مگر ان کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔

یہ سب جان کر بھی ان کا نظریہ یہ تھا کہ مرد کئی کئی بیویاں رکھتے ہیں، یہ ان کا شرعی حق ہے۔ اگر شوہر بیوی کے اخراجات پورے کرتا ہے تو باہر سیاہ سفید کچھ بھی کرے، آخر وہ مرد ہے، یہ تھے ہمارے گھر کی نیک خواتین کے تاثرات۔ جو خود بھی گائے بھینس کی طرح کھونٹے سے بندھی صرف پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے پر قناعت کر رہی تھیں۔ ایسی عورتوں اور طوائفوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ انہیں بھی اپنے مردوں سے جذباتی لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ بھی صرف روٹی، کپڑے اور مکان کے لئے تن بیچتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ وہ نت نئے مرد بدلتی ہیں اور یہ ایک ہی مرد پر اکتفا کرتی ہے۔ اور اگر بدنصیبی سے ایسا شوہر مل جائے جو مرد ہی نہ ہو تو یہ زہر بھی وہ ساری عمر چپکے چپکے پیتی ہے۔ کبھی اُف نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے یہاں اولادیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ہیں ہمارے سماج کے جیتے جاگتے شرعی کردار، ایسے سماج کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے سے بہتر تھا کہ میں اپنی دنیا الگ بناتی۔ میں نے شوہر کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔

میں کمسن ضرور تھی مگر بہت خودسر اور ضدی تھی۔!!

چہرہ چہرہ میری کہانی

تکمیل کی صورت میں بکھر جائے گی تصویر
جو نقش ادھورا ہے، کتابوں میں رہے گا

غم کی لکیر تھی، کہ خوشی کا اُداس رنگ
ہر نقش آئینے میں اُبھرتا چلا گیا

کانپتے ہونٹ، بجھا چہرہ، سلگتی آنکھیں
ایک تصویر میری، اور مصوّر کتنے۔!
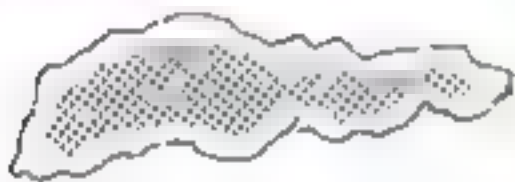
جب انسانوں سے تنہائی ملی ،
تو معصوم پرندوں اور جانوروں
کے ساتھ رفاقت بانٹ لی۔
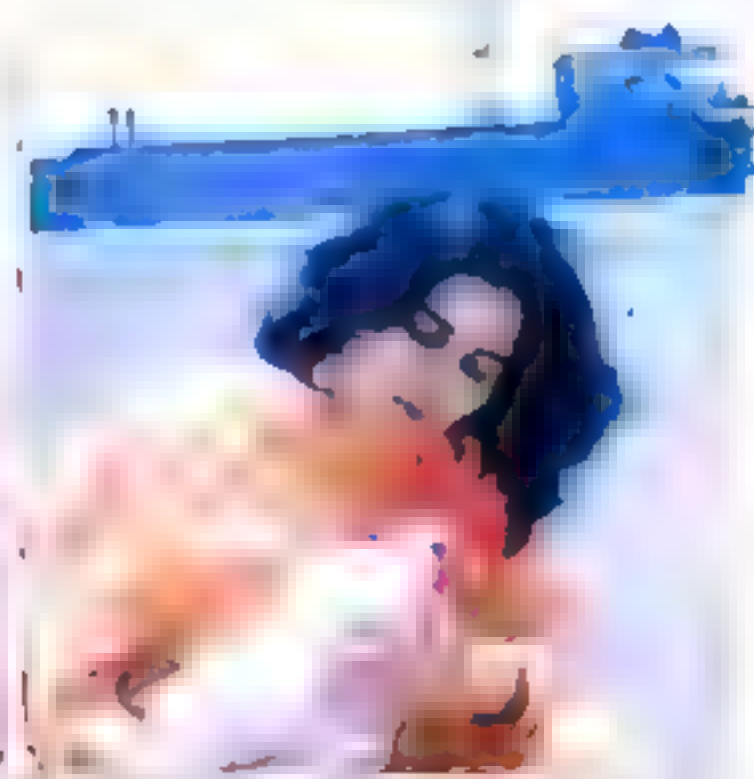
والدہ محترمہ (درمیان میں) اور بہن انجم آرا کے ساتھ نفیس بانو شمع ۔ ایک یادگار

والد محترم عالیجناب سید ابرار احمد صاحب (مرحوم)

نفیس بانو شمع اپنی خالہ صاحبہ اور بہن انجم آرا کے ساتھ ۔ ایک خوشگوار لمحہ
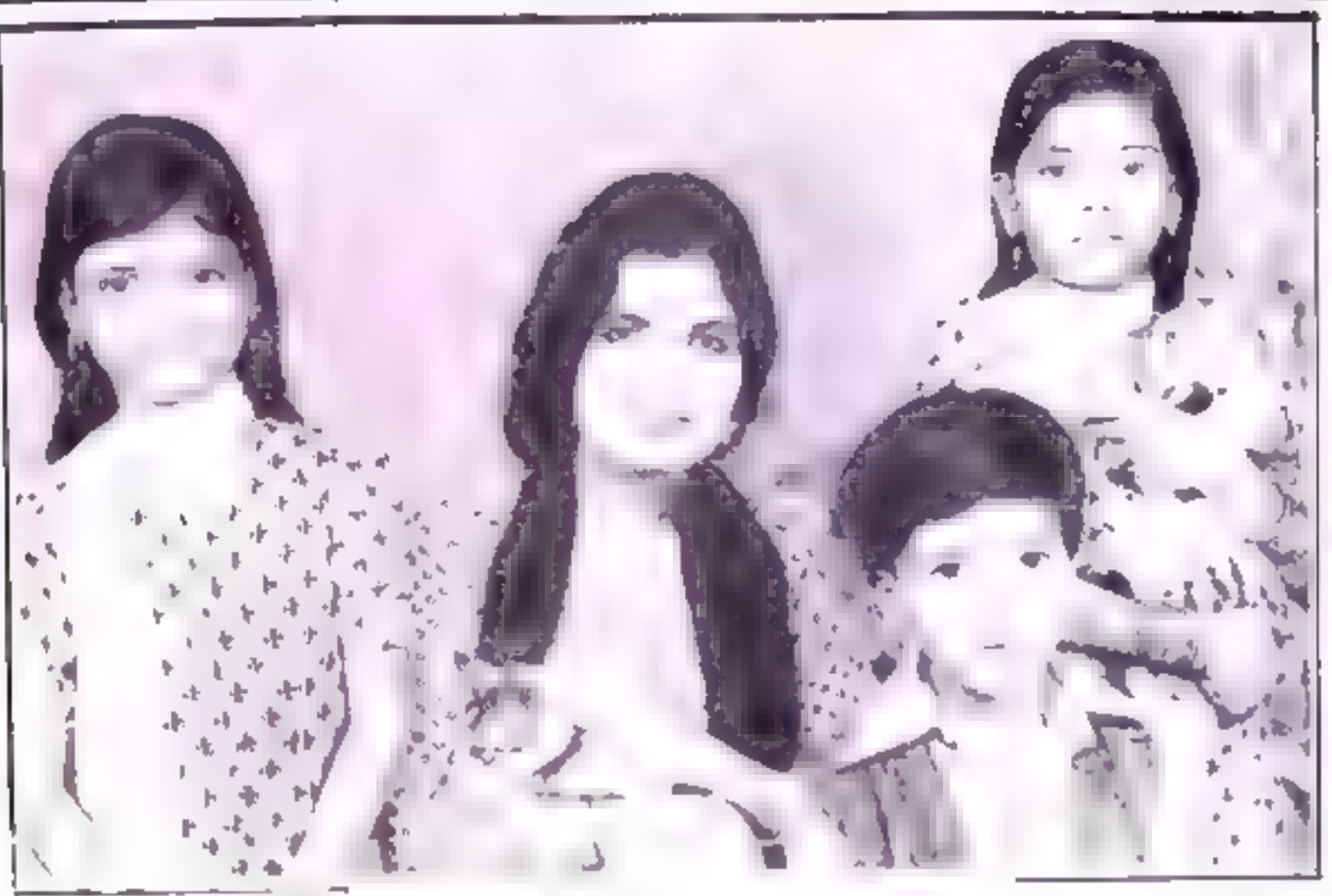
پنے بچوں (دائیں سے) نبیض، فیصل اور دیبا کے درمیان نفیس بانو شمع

پنی دونوں بہنوں (دائیں سے) نکہت صابعہ اور انجم آرا کے ہمراہ نفیس بانو شمع

(دائیں سے) مسز رتنا واسو دیوا اور والدہ محترمہ کے ساتھ ۔ قومی یک جہتی کی ایک مثال

چائے کی چسکی بہنوں کے ساتھ (دائیں سے) نفیس بانو شمع، نکہت اور شمع کے ہمراہ

ایک فیملی گروپ (دائیں سے) بھانجی تنویر، ننھا زید، نفیس بانو شمع، بڑی بیٹی سیدہ فیض، چھوٹی بیٹی فرح دیبا و ننھا فہد اور بہن نجم آرا (اُوپر) بہنوئی محمد لطیف، بھانجا شاہد پرویز، بھانجا شجاع ور داماد سید شجاع الدین نظامی۔

بیٹے فیصل کی گود میں ننھا فہد

ہنسنے کی آرزو میں دبایا جو درد کو
آنسو ہماری آنکھ میں پتھر کے ہو گئے
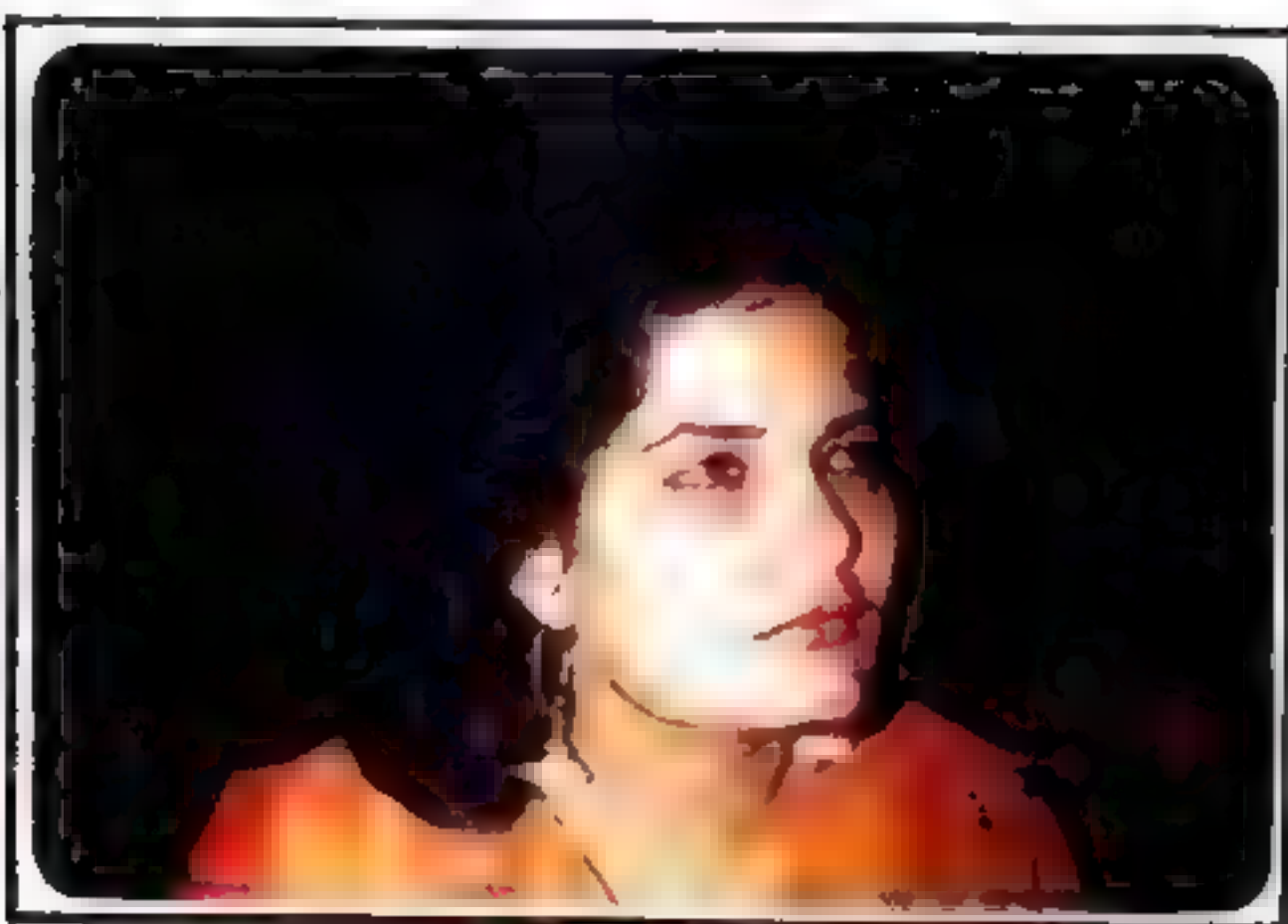
پدم شری بیکلؔ اُتساہی کے ساتھ غریب خانہ پر

پروفیسر عنوان چشتی صاحب سے اپنے گھر پر ایک مُلاقات

ایک مشاعرہ میں: آنجہانی کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ، ایک امریکی مہمان شاعرہ، نفیس بانو شمعؔ اور محترمہ جمیلہ بانو صاحبہ

مسکراہٹوں کا ایک لمحہ محترمہ جمیلہ بانو کے ساتھ

ایک مشاعرہ میں گلوکار جیت سنگھ اور ٹی وی آرٹسٹ سیما بھارگو کے ساتھ نفیس بانو شمع

انا ساگر (اجمیر) میں والدہ کے ہمراہ

بی بی کا مقبرہ (اورنگ آباد) میں

درگاہ حاجی علی (بمبئی) کے ساحل پر

لال قلعہ (دہلی) کے سبزہ زار میں
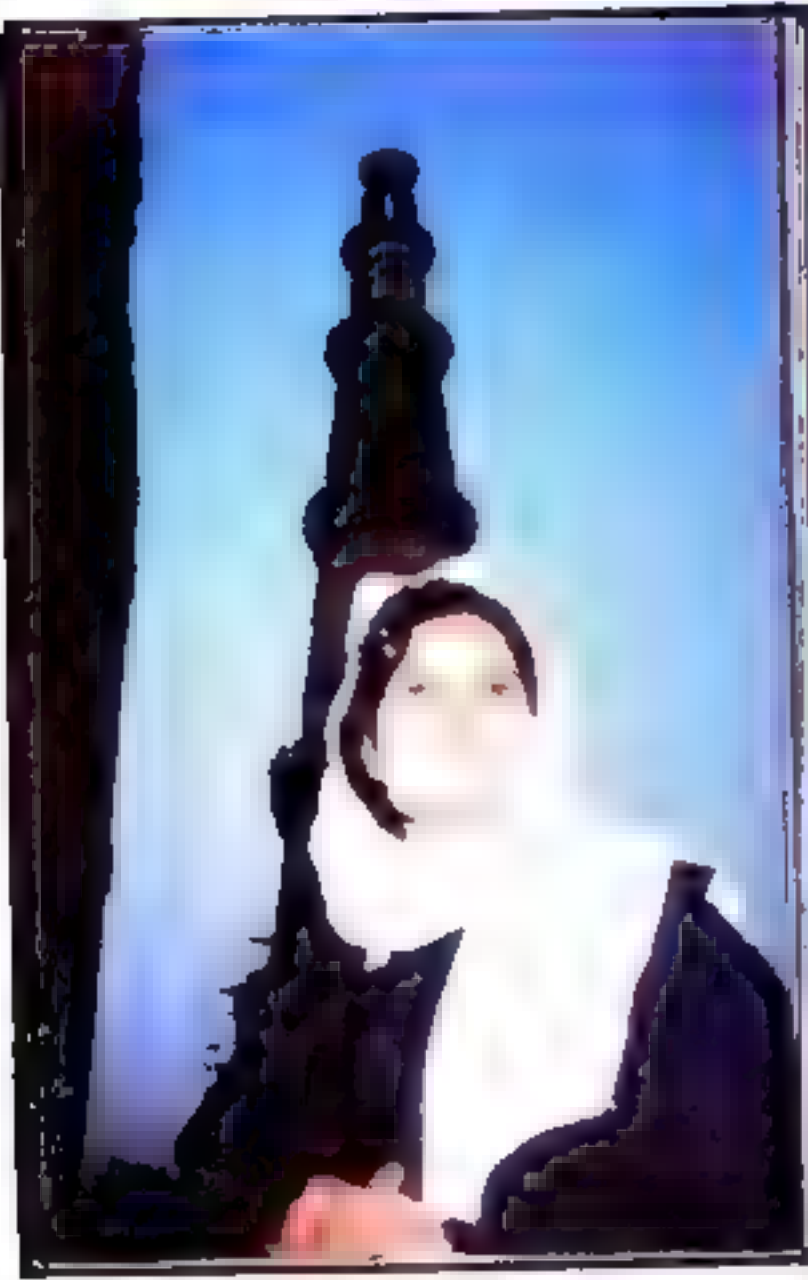
وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

صِرف آنسو ہی زبانِ غم و آلام نہیں،
کچھ تبسّم بھی یہ مفہوم ادا کرتے ہیں
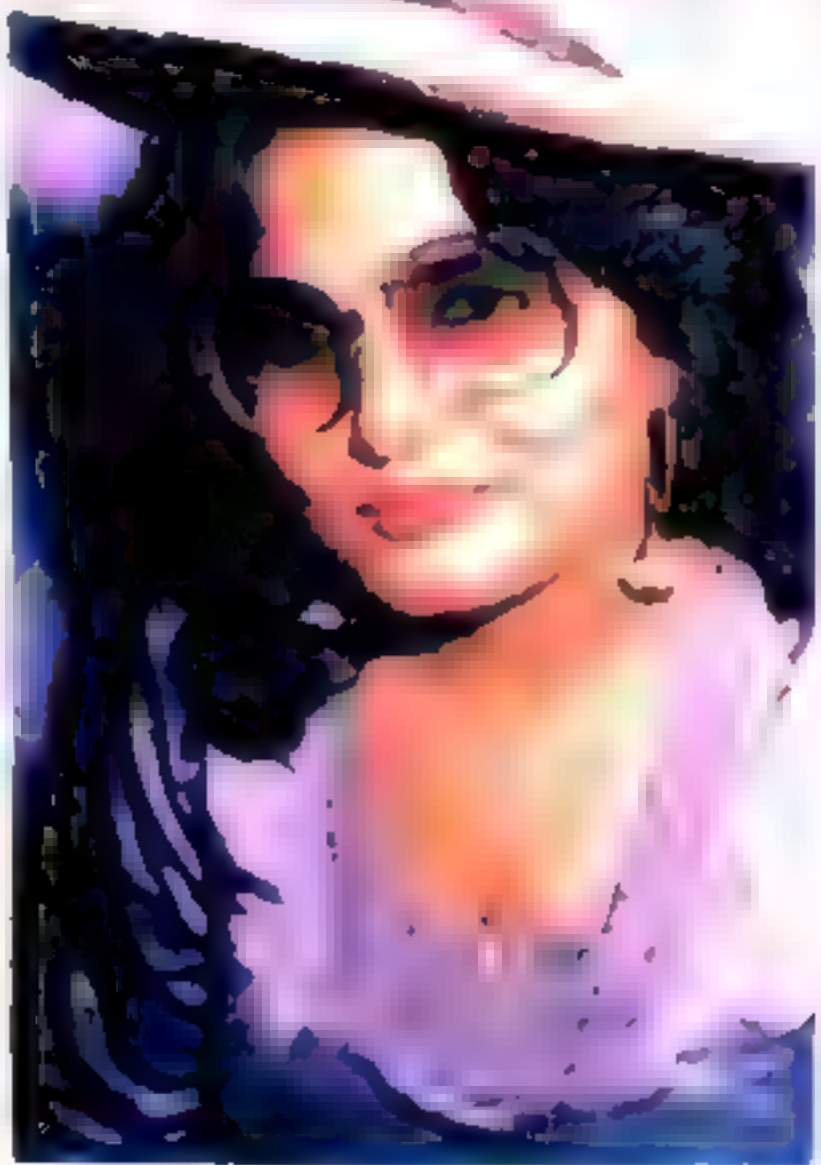
زندگی
کے
مختلف
رنگ

احمد عارض نظامی

ممتا کی چاہتوں کا امین ـــــ احمد عارض
دھنک رنگ محبتوں کا محور ـــــ احمد عارض
پھولوں کے لب پر شبنم کا پاکیزہ قطرہ ـــــ احمد عارض
صدیوں سے جاری روحانی سلسلوں کا وارث ـــــ احمد عارض
اسے جب بھی دیکھتی ہوں، لگتا ہے کہ خون کے رشتے کے علاوہ
اس سے میرا ایک روحانی رشتہ بھی ہے۔

قربان گاہ کی سمت سفر

لمحہ لمحہ سسکتی زندگی ایک سال اور آگے بڑھ گئی۔ بچپن سے اب تک مرد کی جو تصویر میرے سامنے آئی تھی اس نے مجھے مرد ذات سے متنفر کر دیا تھا۔ اور اب وہ نغمہ کہ۔

ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے

اگر فاطمہ سناتی تو میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ میرے احساس میں آگ تھی اور ذہن میں نفرتیں۔

ایک روز میرے نانا نے مجھ سے کہا۔

"بیٹی تمہارے سسر تمہیں لے جانے کے لئے آرہے ہیں"۔

"میں نہیں جاؤں گی"۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ پھر کیا تھا میری اس بغاوت نے گھر میں طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ ماں کی جانب سے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی، نانی کی طرف سے محبت کا واسطہ، ماموں کی شعلہ اگلتی آنکھیں۔ میں کس کس کا مقابلہ کرتی؟ کمرہ بند کر کے دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روتی۔ مگر یہاں آنسوؤں کی زبان سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔

پریشان ذہن نے ایک خواب دیکھا۔

ایک مقام پر مجھے قید کر دیا گیا ہے جہاں میرے ہمراہ فاطمہ ہے گھر کے تمام افراد ہمارے پاس آئے ہیں۔ ماموں، خالہ، نانی، نانا، اماں سب کے ہاتھوں میں بڑا سا چھرا ہے۔ میں پوچھتی ہوں، یہ سب کیا ہے؟ جواب ملتا ہے یہ قربان گاہ ہے جہاں آدم کی بیٹی اللہ کے

حکم سے قربان کی جاتی ہے۔

"نہیں یہ قربانی مجھے منظور نہیں۔ مجھ پر رحم کیجئے۔" میں وہاں کی آہنی دیواریں پھلانگ کر فرار ہو جاتی ہوں۔ میں بے تحاشہ بھاگتی رہی۔ کسی راستے کا تعین نہیں تھا۔ کسی منزل کا خواب نہیں تھا۔ بس آزادی چاہتی تھی۔ ایک ایسی آزادی جس میں عورت اپنے جائز حقوق کے ساتھ سانس لے سکے۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ اس پورے آدم خانے میں عورت کے لئے سکھ کا کوئی گھر نہ تھا۔ باہر کی دنیا گھر کے قید خانے سے بھی زیادہ بھیانک نظر آئی اور مجھے لگا ایک چھوٹی سی قتل گاہ سے فرار ہو کر میں بڑے بوچڑ خانے میں آگئی ہوں۔ سماج کے آہنی نظام نے ایک ناتواں لڑکی کے قدموں میں پھر بیڑیاں ڈال دیں۔

خواب ٹوٹ گیا اور کھلی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک زندہ نعش قبر کے حوالہ کر دی گئی۔ گھر والے مجھے بمبئی بھیج کر مطمئن ہو گئے تھے۔ ہڈی سے ہڈی مل گئی تھی، بوٹی کا چاہے جو بھی حشر ہو۔ اس سے انہیں کیا۔ خاندانی شجرے میں ذکر تو صرف ہڈی کا ہی آئے گا، بوٹی کی تاریخ نہیں دوہرائی جاتی۔!!

اے روشنیوں کے شہر بتا!

بمبئی شہر پہلی بار دیکھا تھا۔ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں، بڑے، بڑے سمندر اور ان کے ساحلوں پر بے حیائی کی حدیں پار کرتے ہوئے پریمی جوڑے۔ ہر طرف بھاگتے ہوئے مشینی انداز کے انسان، سڑکوں پر نیم برہنہ لڑکیاں، یہ سب کچھ دیکھا تو عجیب لگا۔ روشنیوں میں جگمگاتا ہوا شہر جب دیکھتی تو اس وقت اپنے گاؤں کا وہ کچا آنگن اور طاق میں رکھا ہوا ایک ننھا سا چراغ شدت سے یاد آجاتا۔

اس شہر کی عمارتیں بڑی تھیں، مگر دل چھوٹے، سچائی، خلوص اور ہمدردی کے نام پر جھوٹ، فریب، اور تصنع کا کاروبار تھا۔ یہاں ایک ہی بلڈنگ کے الگ الگ فلور پر رہنے والے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے۔ یہاں ہر کام مشین سے ہوتا۔ مسالحہ سے لے کر کپڑے جھاڑو تک کے لئے مشین استعمال ہوتی۔ ایسا لگتا انسانوں کے اندر بھی مشین فٹ کردی گئی ہو۔ ان کا چلنا پھرنا باتیں کرنا سب کچھ مشینی انداز کا ہوتا۔ مصروفیت کا یہ عالم کہ اگر کوئی مسافر راستہ معلوم کرے تو کسی بھی سمت ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھ جانا، آج بھی بمبئی کا عام دستور ہے۔

جب میں اپنے گاؤں سے اس شہر کا موازنہ کرتی، مجھے اپنے گاؤں کا صاف ستھرا، محبتوں والا ماحول بہت یاد آتا، پتھر کی سل پر مسالحہ پیستی ہوئی بوا، پتھر کی چکی پر جھوم جھوم کر مکئی اور باجرے کا آٹا پیستی ہوئی نوکرانیاں، مٹی کا چولہا، لکڑی کی آگ پر پکتی ہوئی ہانڈیاں،

شام کے وقت آنگن میں بیٹھی ہوئی ہاتھ کے پنکھے جھلتی ہوئی خواتین اور ان کے بجے سجائے پاندان، کیا کیا نہ یاد آتا، سردیوں میں ٹھنڈ سے بچنے کے لئے گرم گرم بوری (کانگڑی جیسی چیز) جسے شام ہوتے ہی تیار کیا جاتا۔ ٹھنڈ زیادہ بڑھ جاتی تو آگ کے بڑے بڑے الاؤ جس کے گرد ہم سب دائرہ کی شکل میں جمع ہو جاتے۔ کبھی ہاتھ سینکتے کبھی پیر کبھی رخسار پر ہتھیلیاں رکھتے، الاؤ کے سامنے بیٹھ کر ہم سب شعلہ رخ نظر آتے۔

ایامِ سرما میں بڑے بڑے ہال نما کمروں میں پوال (دھان کے باریک تنکے) جو بہت گرم ہوتے ہیں بچھائے جاتے، اس پر نرم گدے، اس وسیع اور کشادہ بستر پر گھر کے کئی افراد ایک ساتھ سوتے رات دیر تک قصے اور کہانیوں کا سلسلہ چلتا۔

صبح بہت سویرے اٹھتے، گاؤں کی صبح انتہائی دلفریب ہوتی ہے ہر طرف مختلف پرندوں کی چہچہاہٹ، چوپیوں کی آوازیں، سامنے کنویں سے موٹ کے ذریعہ کھیتوں کی سینچائی کرتے ہوئے مزدور کسان، میدان میں چلتا ہوا کولہو جسے بیل کھینچتا۔ کڑاہے میں پکتا ہوا گنے کا گڑ جو گرم گرم کھایا جاتا اور بہت لذیذ ہوتا۔ یہ ساری لذتیں سارا منظر ساری کیفیتیں خواب بن کر رہ گئی تھیں۔

میرے نانا کا خط آتا تو نصف خط میں نانی کا ہی ذکر ہوتا کہ وہ مجھے کتنا یاد کرتی ہیں، کس قدر روتی ہیں، نانا اور نانی کے سر پر تیل کی مالش کرنا میرا روز کا معمول تھا اور اب میرا کام میری خالہ انجام دے رہی تھیں مگر بقول خالہ کے، میں جب تک اماں کے سر پر مالش کرتی رہتی ہوں، ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ یہ کیسا رشتہ تھا کہ بیٹی سے زیادہ نواسی پیاری تھی۔ یہ محبت شاید اپنا ایک الگ رشتہ بناتی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا مجھے بھی اپنی نانی کی وہ گود بہت یاد آتی جس میں میرا بچپن بیتا تھا۔ وہ صرف نانی ہی نہیں میری ماں بھی تھیں۔ ایک ایسی ماں جس نے پھول کی طرح میری پرورش کی تھی، ناز اٹھائے تھے اور مجھ پر محبتیں نثار کی تھیں۔

میری ایک عادت تھی کہ شوربہ والا گوشت میں نہیں کھاتی تھی جب چولہے پر چڑھا ہوتا، ادھ کچا بھونتے وقت میرے لیے نکال لیا جاتا۔ میرے بعد بھی نانی نے یہ

معمول جاری رکھا تھا۔ ادھ کچا گوشت ہانڈی سے نکال لیتیں، گھر کے کسی بھی فرد کو کھلا دیتیں اور خوب روتیں۔

بچپن سے جوانی تک نانی کے ساتھ سوئی تھی، مجھے رات کو بہت ڈر لگتا تھا اس لیے جاگتے میں کبھی بھی نانی کو دوسری طرف کروٹ نہیں بدلنے دیتی تھی۔ خوشبو بچپن سے ہی بہت پسند کرتی ہوں، یہاں تک کہ بالوں میں جو تیل استعمال کرتی وہ بھی خوشبو دار ہی ہوتا۔ میرے بعد نانی وہی جانی پہچانی خوشبو تکیہ پر لگا کر تصور میں اپنے سے مجھے قریب محسوس کرتیں اور کبھی کبھی پھوٹ پھوٹ کر روتیں، مگر تقدیر دیکھئے کہ محبت کے چمن سے نکل کر میں بمبئی کے چھوٹے چھوٹے تاریک کمروں میں تنہائی کا زہر پی رہی تھی۔ جی ہاں، میں اب بھی تنہا تھی۔! وہ جس کا نام رفیق تھا زندگی کے کسی موڑ پر بھی رفیق ثابت نہ ہوا۔ درجنوں دوست تھے (وہ بھی غلط قسم کے) بے شمار محبوبائیں۔ کس کس سے جانے کیا کیا رشتہ تھا؟ ایسے ایسے شوق کہ قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ ایک شخص اتنے حصوں میں بٹا ہوا تھا کہ بیوی کے لئے وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ میں اکثر سوچتی ہر راستے کی ایک انتہا ہوتی ہے، کبھی تو سچائی کی جیت ہوگی مگر وہ میرے انتظار کو طویل کرتے چلے گئے۔ اب میرے حصے میں صرف محرومی اداسی اور کرب تھا۔

جب میں ان کی سرد مہری اور لاپروائی کا گلہ کرتی تو مجھے جواب ملتا۔ اپنی مرضی کا کھاؤ، اپنی مرضی کا پہنو، میرے معاملہ میں دخل مت دو، میں مرد ہوں جو کرتا ہوں وہ نئی بات نہیں ہے۔ سبھی پیسے والے ریس کھیلتے ہیں، کلب جاتے ہیں نت نئی عورتوں سے ملتے ہیں، تمہارا کام صرف گرہستی سنبھالنا ہے نہ کہ میرے عیب گنوانا، اور اگر یہ سب کچھ منظور نہیں تو اپنے میکے جا سکتی ہو۔

میکے بھیجنے کی دھمکی مجھ پر اثر کر جاتی اور میں اپنے ہونٹ سی لیتی، میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ضعیف نانا، نانی کو میری طرف سے پھر کوئی صدمہ پہنچے۔ میں نے ان پر ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ میں اپنے گھر بہت خوش ہوں!

حصارِ جبر میں زندہ بدن جلائے گئے
کسی نے دم نہیں مارا مگر دھواں بولا۔ !!

سلسلہ ٹوٹ کر بکھرنے کا

جب میں پہلی بار ماں بنی تو سوچا، بچی کی محبت بگڑے ہوئے باپ کو راہ راست پر لے آئے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک ہی گھر میں اجنبی کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ضرور تاً گفتگو کر لیا کرتے۔ اول تو وہ گھر میں ہی کم ہوا کرتے تھے۔ جب ہوتے تو ان کی تمام تر توجہ جاسوسی ناولوں پر ہوتی، جسے پڑھتے پڑھتے وہ سو جاتے۔ کسی مسئلہ پر میں کوئی بات کرنا چاہتی تو کہتے "مجھے ڈسٹرب نہ کرو، صبح بات کر لینا میں ابھی پڑھ رہا ہوں"۔ میری حیثیت ایک جاسوسی ناول سے بھی کمتر تھی۔ یہ ایک دن کی بات نہیں، روز کا یہی معمول تھا میں ساری ساری رات کمرے کی چھت کو تکتے ہوئے گزار دیتی۔ روز بروز کوئی شے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے اندر بکھر رہی تھی۔

جب بھی کوئی نیا یا اچھا لباس پہنتی اور پوچھتی کہ "میں کیسی لگ رہی ہوں؟" تو بے رخی سے جواب ملتا "آئینہ میں دیکھ لو۔ مجھے ڈسٹرب کیوں کر رہی ہو" طبیعت کی خرابی میں اگر ہاتھ بڑھاتی کہ دیکھئے مجھے بہت تیز بخار ہے تو جھلا کر بولتے۔ "میں کیا کروں۔ میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں۔ نوکر کو ساتھ لے لو دواخانہ چلی جاؤ"۔ اب اس پتھر کے انسان کو کون سمجھاتا کہ سب سے بڑا طبیب اور مسیحا شوہر ہوتا ہے۔ شوہر ہی اگر زخم دینے لگے تو وہ لا علاج بن جاتا ہے زندگی سے ہار کر ایک روز بہت سارا زہر کھا لیا مگر اس بار بھی موت مسکرا کر میرے قریب سے گزر گئی۔ دس روز اسپتال میں رہ کر گھر آئی تو

شدید نفرتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میکے جا کر مرو، مجھے کیوں پھنسوانا چاہتی ہو؟"

ظلم و تشدد مزید بڑھ گئے۔

بائیس سال کی عمر میں اب میں تین بچوں کی ماں تھی۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا، اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جب آپس میں محبت نہیں تو بچے کیسے پیدا ہو گئے؟ نادانوں سے کوئی پوچھے کہ طوائف بھی تو ماں بنتی ہے اس سے کون محبت کرتا ہے؟ طوائف کے لیے تو اختیاری بات ہے مگر بیوی تو مجبور ہوتی ہے، انکار کرے تو روٹی، کپڑا، بند، لات گھونسوں کی بارش شروع۔ اس سے بہتر ہے کہ بیوی تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو طوائف ہی سمجھ لے۔ ایک چھت کا سایہ، تن پر کپڑے، دو وقت کی روٹی، اور بچوں کو ان کا باپ تو ملے گا۔

یہ سچ ہے کہ ظلم سہنا بھی ظالم کی مدد کرنا ہے مگر بغاوت کر کے جاتی بھی کہاں؟ اس وقت تک گریجویشن بھی نہیں کیا تھا۔ صرف دسویں پاس تھی۔ خود کفیل بنتی بھی تو کس طرح؟۔

ندی سے ساگر تک

ہر تاریکی کے بعد اجالا آتا ہے۔ 1976 میرے لیے ایک ایسا آفتاب لے کر طلوع ہوا جس کی روشنی نے میری زندگی بدل دی۔ ضلع رامپور کے ایک گاؤں بھینسوڑی شریف کے سجادہ نشین صوفی لیاقت حسین (منے میاں) ہماری ہی بلڈنگ میں واقع خانقاہ میں تشریف لائے۔ وہ بہت مبارک گھڑی تھی جب میں ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور سلسلۂ چشتیہ ابوالعلائی میں داخل ہوئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ پیری مریدی کیا ہوتی ہے۔ بس اتنا یاد رہا کہ مرشد کے رومال کا ایک کونا میری زندگی کے ہر گوشہ کو منور کرتا چلا گیا۔ ایک بجھتی ہوئی شمع پھر جل اٹھی۔

غم سے نجات مانگی تو میرے حبیب نے
غم ہی کو میری زیست کا ساماں بنا دیا

مگر اس بار غم میں جو مزہ تھا، جلنے میں جو لطف تھا، اضطراب میں جو کیف تھا، اس سے پہلی بار آشنا ہوئی تھی۔ باطنی طور پر انہوں نے میری جو اصلاح کی جو عنایات کیں وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں۔ یہ صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس راہ سے گزرا ہو۔

شوہر کی بے وفائیوں اور ظلم و تشدد کا اب بھی وہی حال تھا مگر جانے وہ کیا شئے قلب کے اندر سرایت کر گئی تھی جس نے مجھے چٹان کی طرح مضبوط کر دیا تھا۔ قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑا دکھ مسکراتے ہوئے سہہ رہی تھی۔ لوگوں سے زیادہ

میل جول اور تعلقات سے وحشت ہوتی۔ خاموشی اچھی لگتی۔ عبادت کی طرف طبیعت مائل رہتی۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے سکون ملتا۔ بزرگوں کے آستانے پر جا کر روح سرشار ہو جاتی۔ مرشد کی ہدایت تھی، کثرت سے درود شریف پڑھا کرو۔ اور میں نے چند ہی دنوں میں محسوس کیا کہ یہ وہ نعمت ہے جو بغیر کثرت کے ہی دل کے تاریک گوشوں کو منور کر دیتی ہے اور اس کا وِرد انسان کے اندر محبت کا ایک سمندر تخلیق کرتا ہے۔

مطالعہ وسیع ہوا تو تصوف کی یہ کتابیں باری باری میری روح سے ایک رشتہ قائم کرتی چلی گئیں۔ کشف المحجوب، سیرتِ فخر العارفین، احیاء العلوم، کیمیائے سعادت اور شیخ سعدی کی گلستاں بوستاں نے وہ کام کیا جو آج تک میرے طبیب اور سائیکریٹسٹ نہ کر سکے تھے۔ اکثر میں بیمار رہتی اور ڈاکٹر مجھ سے یہی کہتے۔ میں بہت حساس ہوں جس کی وجہ سے طرح طرح کی جسمانی اور دماغی تکلیف میں مبتلا رہتی ہوں۔

سوچتی تو میں اب بھی تھی۔

مگر اس سوچ میں جانے وہ کون سا احساس شامل تھا جو میرے تمام زخموں کی ٹیس اور سارے درد پر حاوی تھا۔ یا شاید اس کیفیت سے گزر رہی تھی۔ بقول شاعر۔

پڑ گیا پردہ سماعت پر تیری آواز کا
ایک آہٹ کتنے ہنگاموں پہ حاوی ہو گئی

اندازِ فکر بدلا تو عقیدے کو یہ بات پختہ کرتی چلی گئی کہ انسان کے ساتھ جو کچھ گزرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر دکھ تکلیف خوشی راحت، موت و زندگی، لوحِ محفوظ میں دنیا بنانے سے قبل درج کر دی گئی ہے۔ کتنی صداقت ہے میر کے اس شعر میں کہ۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جب یہ یقین آگیا کہ تمام افعال کا محرک کوئی اور ہی ہے تو ظالم کو بھی ظالم کہنا ترک کر دیا۔ دشمنوں سے گلے شکوے نہ رہے، وہ لمحات بھی ایک تاریخ کی طرح صدیوں کے سینے پر درج رہیں گے۔ جب ایک ہاتھ میری جانب بڑھا تھا اس ہاتھ کی لکیروں میں میں تو کہیں نہ

تھی۔ مگر میرے لیے ہمدردی، قربانی، ایثار جانے کیا کیا تھا اس میں، جسے میں نے دیری کے ساتھ ایک نازک بہار کو سونپ دیا اور اپنے اس فیصلہ پر آج تک میں مطمئن ہوں۔

اے دل خوشی کا ذکر بھی کرنے نہ دے مجھے
غم کی بلندیوں سے اترنے نہ دے مجھے

زندگی ایک ایسے عالم میں کٹ رہی تھی جسے نہ تو اضطراب سے تعبیر کر سکتے ہیں نہ سکون سے، لمحہ لمحہ، ساعت ساعت، پل پل رات کے زنداں میں ایک شمع جل رہی تھی۔

قیام کی حالت ہو یا سفر کی دل کی افسردگیاں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ ایک غم کو الوداع کہتے تو دوسرے کو لبیک کہنا پڑتا۔ اب نہ محرومی پر افسوس ہوتا نہ حصول پر خوشی۔

دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر جانے کب اپنی ذات کے سفر پر نکل پڑی۔ یہ سفر بھی خوب تھا اپنے اندر ایک جہان سمیٹے ہوئے۔

اب مجھے عشق تھا، اس پوری کائنات سے، نیلے آسمان پر تیرتے اپنے پر پھیلائے چہچہاتے آزاد پرندوں سے، ٹھہرے ہوئے رات کے سناٹوں سے پگھلتی ہوئی سیال چاندنی سے، سمندر کے سینے میں بند بپھرے ہوئے منہ زور طوفانوں سے، اونچی پہاڑیوں کی بلندی سے گرتے گیت گاتے آبشاروں کی شوخی سے، ننھے منے ستاروں کے دل میں دھڑکتی خاموشی سے اور صبح کی پہلی دستک پر کھلنے والے شاداب پھولوں سے۔!!

اس جنوں کا میں نام کیا دیتی؟

اور ایک شام یہ حادثہ بھی ہوا کہ ایک شئے نے پل بھر میں کائنات کے تمام منظر پر اپنا سایہ ڈال دیا۔ یہ بھی ستمبر کی ہی ایک شام تھی۔ ستمبر جس میں کہ برسنے والا ابر مشہور ہے کہ اس سے سیپ میں موتی، کیلے میں کافور، بانس میں بنسلوچن اور سانپ میں زہر مہرہ بنتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ابر نیساں نے میرے قلب کے اندر بھی کچھ تخلیق کر دیا تھا اس ایک لمحہ میں، جب میں نے ایک عبادت گاہ کے دروازے پر اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ جانے کہاں سے آیا تھا؟ میں حیران سی کھڑی تھی۔ اس وقت میری کیفیت مصر کی ان عورتوں جیسی تھی جب ایک مجلس میں یوسفؑ کو دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ ڈالی تھیں اور کہا تھا۔

ماھذا بشراً ان ھذا الا ملک کریم ٥

یعنی یہ شخص آدمی نہیں یہ تو کوئی فرشتہ بزرگ ہے۔

فرشتوں سا روپ لیے وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میرا سارا وجود بارگاہ حسن میں سر بہ سجود ہو گیا۔ وہ کوئی انسانی شئے نہیں یقیناً جلوۂ خدا تھا۔ چہرے سے ہٹ کر میری نظر اس کے قدموں پر رک گئی اور ایسا لگا ساری عمر کے سجدے پل بھر میں ادا ہو گئے۔

اصحاب کہف کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد باری ہے کہ۔

فضربنا علی اذانھم فی الکھف سنین عدداً ٥

تو ایک ہی جذب ملی الاذن کی حالت مجھ پر بھی طاری ہو گئی۔ گویا جس
دنیا میں ہم بستے تھے، وہ دنیا ہی نہ رہی۔
تمام صورتیں او جھل ہو گئیں۔ ایک ہی چہرا پیش نظر تھا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر مصلے پر خدا سے دعائیں مانگتی کہ اس کے خیال سے رہائی دے
یہ سب کیا تھا؟ کیوں تھا؟ کیسے تھا؟ میری سمجھ سے بالا تھا۔ کہتے ہیں عشق وہ معمہ ہے جسے
عقل والے بھی سمجھنے سے قاصر ہیں یہ جذبہ تو اس مصور ازل کا تخلیق کردہ ہے اور لکھنے والا
ہی جانتا ہے کہ لفافے میں کیا ہے؟

لمحہ لمحہ سسکتی زندگی نے دو سال کی مسافت مزید طے کر لی تھی۔ رگ جاں میں اتر
جانے والا اب بھی اسی انداز سے میرے اندر موجود تھا۔ اور اب میں جگر کے اس شعر کی
مکمل تفسیر بن چکی تھی۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

میں ڈوب چکی تھی۔ میرے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ کوئی کنارا نہ
تھا، کسی منزل کا سراغ نہ تھا۔ بس ایک سفر تھا۔ سفر مسلسل، میری تمام حسرتیں عدم کے
پردے میں چھپ گئی تھیں۔

لوگوں نے بتایا کہ میں بہت بیمار ہوں۔ ایک دم زرد پڑ گئی ہوں، کمزور اور نحیف ہو
گئی ہوں، ڈاکٹر کہتے۔ میں زیادہ سوچا نہ کروں، تو میری آنکھوں سے آنسو آ جاتے، کسی کو کیا
معلوم کہ میں کس مرض لاعلاج میں مبتلا تھی۔ اللہ کے بعد اس راز کی واحد رازدار صرف
میں ہی تھی۔ میری اس حالت کا علم تو اسے بھی نہ تھا جس کی ایک جھلک نے میرے سازِ
ہستی پر ایک پرسوز گیت چھیڑ دیا تھا اور اب یہ آواز میری فنا کی آواز تھی۔!

میں گم تھی اپنا کہیں پتہ نہ تھا، کائنات کے ذرے ذرے میں صرف اس کے وجود
کی آہٹ سن رہی تھی۔ کھانا پینا، سونا، جاگنا، سب کچھ درد و کرب کے حوالہ ہو گیا تھا۔ اپنے
آپ کا ہوش نہ تھا۔ ہفتوں بعد جب اپنے بالوں میں کنگھی کرتی تو الجھ کر ٹوٹے ہوئے بال جیسے

لفظوں کی صدا بن جاتے۔

سورج نکل آیا ہے اجالے نہیں پھوٹے
ماضی میں جو تھا صبح کا کردار وہی ہے

اس غم کی راہ میں ایک روز پھر ہار گئی۔ ایک ساتھ نیند کی کئی گولیاں کھا کر بستر پر خاموشی سے اس لیے لیٹ گئی کہ اب ابدی نیند مل جائے گی اور اضطراب ختم ہو جائے گا مگر جب تین روز کی مسلسل بے ہوشی کے بعد ہوش آیا تو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ موت پھر مجھ سے کترا کر نکل گئی تھی اور میں اپنے دوزخ کی گہرائیوں میں پھر سے اتر گئی۔!!

رنگ پھر بھر دیا مصوّر نے

اس بار جب سالانہ دورے پر میرے پیر و مرشد حضرت منے میاں ہمارے شہر میں تشریف لائے، زیارت کے لئے میں ان کی خانقاہ پر حاضر ہوئی تو اب بھی یاد ہے انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا تھا جیسے سوال کر رہے ہوں "کیسا لگا یہ سفر؟"

میں نے بے ساختہ کہا۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔"

اور ان کے قدموں پہ گر کر زار و قطار رو پڑی۔ اس روز کے بعد سے تقریباً میرا معمول بن گیا کہ خانقاہ پہنچی، منے میاں کا چہرہ دیکھا اور آنسوؤں کا سیلاب ابل پڑتا تھا۔ اور اس بات پر مجھے حیرت تھی کہ میرے پیر و مرشد نے اس عرصے میں ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے؟

آج نوچندی جمعرات تھی۔

خانقاہ کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ عطر، اگربتی اور پھولوں کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ محفلِ سماع شروع ہوئی۔ میں خانقاہ کی کھڑکی سے (جو میرے گھر کی گیلری میں کھلتی تھی) سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ قوال نے جیسے ہی یہ شعر پڑھنا شروع کیا کہ —

آفاق ہا گردیدہ ام ، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام ، لیکن تو چیزے دیگری

مجھ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ارد گرد کے ماحول سے بے خبر۔ مجھے

ایسا لگنے لگا، میں ایک کمرے میں ہوں اور میرے سامنے ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

"کس حال میں ہو بیٹا؟"

میں نے روتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"خدارا میری مدد کریں، مجھے اس آزار سے بچائیں"۔

انہوں نے مجھے مسکرا کر دیکھا، پھر فرمایا۔

"یہ راز کی بات ہے، جاننا چاہتی ہو؟ آؤ میرے قریب" اور پھر میرے کان میں آہستہ سے انہوں نے ایک جملہ کہا، جس پر میں زور سے ہنس پڑی۔ اسی وقت میں ہوش میں آ گئی۔ سارا منظر جوں کا توں یاد رہا مگر وہ راز کی بات جانے کیا تھی، جو مجھے بھلا دی گئی۔

اگلے روز تصوف کے مضامین پر مشتمل کتاب "مجموعہ چہل رسائل" کے کچھ اوراق میرے سامنے کھلے پڑے تھے، لکھا تھا۔ عشق کا دریا نہایت عمیق ہوتا ہے۔ عبارت یا اشارات یا ادراک و فہم یا وہم سے اس کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ سب اس کے ساحل کی باتیں ہیں۔ اس کی گہرائی کا ذکر ممکن ہی نہیں۔ آگے لکھا تھا۔

"عاشق انتہا کو پہنچ کر اپنے علم سے بے علم ہو جاتا ہے یعنی باوجود جاننے کے یہ جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں۔

" العجز عن درك الادرك ادراك٥

یعنی۔ ادراک کے سمجھنے سے عاجز ہونا ہی ادراک ہے اور بغیر سمجھے، سمجھنے کا دعویٰ کرنا جہالت ہے۔

"انوار الفرید" میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عشق کی فوقیت کو اس طرح ظاہر فرمایا کہ حضرت یحییٰ بن معاذ رازی نے فرمایا۔

"محبت کا ایک ذرہ تمام جنوں اور انسانوں کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔"

حضرت شیخ شرف الدین منیریؒ نے عشق کی تعریف میں فرمایا کہ۔

"عشق ایک ایسی سواری ہے جس کی ایک دوڑ دونوں عالم کو عبور کر

جاتی ہے۔ اور اس کی جولانیاں امکان تک پہنچتی ہیں۔"

مولانا روم نے تو عشق کو تمام ظاہری اور باطنی بیماریوں کا طبیب فرمایا ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ۔

"تین چیزیں ہیں جو انسان کو اعلیٰ رفعت تک پہنچاتی ہیں۔ عقل، علم، عشق۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عقل، علم کے بعد ایک اور اعلیٰ شرف عشق سے نوازتا ہے تو اس کو کسی اہل دل کی محبت سے منسلک کر دیتا ہے۔ اہل دل سے مراد عاشقان الٰہی ہیں۔ اہل دل کی محبت سے عشق کی دولت فوراً ہی حاصل ہوتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ میں ایک ایسے اہل دل اور اہل نظر سے وابستہ ہو چکی تھی، جو مردوں کو زندگی بخشتے ہیں۔

مگر میرا عشق، عشق حقیقی تو نہ تھا۔ میں مجازی میں تھی۔ پھر میرے لیے یہ سارے امتحانات کیوں تھے؟ مجھے کانٹوں پر سے کیوں گزارا جا رہا تھا؟ کوشش اور دعاؤں کے باوجود اس کا چہرہ میری نظروں سے اوجھل کیوں نہیں ہو رہا تھا؟ کیوں اس کا نام اسم اعظم کی طرح ہر پل میرے ہونٹوں پر رہتا تھا؟

اسرار یزداں کی طرح میں اپنے ہی اندر کہیں الجھتی جا رہی تھی۔!!

شہرِ جاناں سے چلی اور تیرے در تک پہونچی

جنون نے دامن تھاما اور میں نے رختِ سفر باندھ لیا۔ 1979 میں پہلی بار دہلی کے لئے تنہا نکل پڑی۔ یہ شہر میرے لئے اجنبی تھا۔ دلی میں چوں کہ میری والدہ اور بہنیں بھی مستقل رہائش پذیر تھیں کچھ دنوں ماں اور چھوٹی بہنوں کی محبت نے سنبھالا دیا۔ مگر

تقاضائے تقدیر تو کچھ اور ہی تھا۔ اضطراب بڑھ گیا۔ ایک روز میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دنیا ترک کر دوں گی۔ گوشہ نشینی تو ممکن نہ تھی۔ دہلی "ساؤتھ ایکس" پر واقع "Women Ashram" میں پہونچی، جہاں ہر مذہب کی خواتین دنیا تیاگ کر راہبہ بن سکتی ہیں ان کو اپنا ارادہ بتا کر ایک ہفتہ بعد آشرم میں داخلہ کی اجازت لی۔

اگلے روز والدہ مجھے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ شریف پر زیارت کے لیے لے گئیں۔ محبوبِ الٰہی کے آستانے پر یہ میری پہلی حاضری تھی۔ اس وقت قوالی ہو رہی تھی۔

زندگی غم کی کڑی دھوپ میں دم لینے کو
آپ کے سایۂ دیوار تک آپہنچی ہے

پھر مجھے یاد نہیں کہ آنسوؤں کا جو سیلاب امڈ آیا تھا وہ کہاں جا کے رکا، ہاں اتنا یاد ہے کہ جب ان کے در سے اٹھی تو محسوس ہوا جیسے کوئی ہاتھ میرے دل پر ہو۔

برسوں بعد اس رات میں جی بھر کے سوئی۔ صبح اٹھی تو پچھلی شب کا اثر پورے وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ جی چاہا اسی پل اڑ کر محبوبِ الٰہیؒ کے آستانے پر پہنچ جاؤں۔

میرا قیام کوٹلہ مبارک پور میں تھا۔ جہاں سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا عدقہ تین کلو میٹر دور ہے مگر عقیدتیں فاصلوں کو نہیں ناپا کرتیں۔ اس روز کے بعد سے یہ میرا معمول بن گیا تھا کہ روزانہ کسی بھی وقت آستانے کے لئے تنہا اور پیدل چل پڑتی۔ چوں کہ بس یا آٹو رکشہ وغیرہ کی عادت نہیں تھی۔ آستانۂ مبارک پر گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ خاموش سی، گم صم سی، رنجیدہ رنجیدہ، آنکھیں مسلسل بھیگی رہتیں۔ میں وہاں کوئی منت مراد لے کر نہیں جاتی تھی بس مجھے اس در سے سکون ملنے لگا تھا۔ اور اب راہبہ بننے کا خیال دل سے ایک دم نکل چکا تھا۔ یہ بھی محبوبِ الٰہیؒ کی کرامت تھی۔

اس روز دوپہر کا وقت تھا۔ درگاہ شریف سے آکر تھکی ہوئی بستر پر لیٹی ہی تھی کہ آنکھ لگ گئی۔ دیکھا کہ ایک بزرگ صورت شخص آئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"تمہاری زندگی محبت سے شروع ہوئی ہے اور محبت پر ہی ختم ہوگی"

اتنا کہہ کر وہ بزرگ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے اور اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔

میں حیرت زدہ سی بستر سے اٹھ کر زینے کے اس راستے کو اب بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ بزرگ گزر کر گئے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ خواب تھا۔ محسوس ہو رہا تھا یہ منظر حقیقت میں دیکھا ہو۔

یہ کیسے کیسے خواب تھے، کیسی کیسی بشارتیں تھیں؟ میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ جانے وہ کون تھا جس نے مجھے یہ خوشخبری دی تھی کہ۔

"تمہاری زندگی محبت سے شروع ہوئی ہے اور محبت پر ہی ختم ہو گی"۔

مجھے آغاز کا علم تھا نہ انجام کی خبر۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ موت کی تمنا کسی مجبوری، غم یا گھبراہٹ میں نہیں بلکہ شوق سے کرتا ہے اور ان دنوں میں بھی اسی عالم شوق سے گزر رہی تھی۔

راستے میں جب کسی کا جنازہ دیکھتی تو حسرت ہوتی۔ کاش! اس مرنے والے کی جگہ میں ہوتی۔ بے نیازی کے جانے کن مراحل میں تھی۔ نہ اپنا خیال کبھی آتا، نہ اپنے ان بچوں کا جنہیں بمبئی چھوڑ کر آئی تھی۔ محبوب الٰہیؒ کے آستانے پر حاضری کا معمول بدستور جاری تھا۔ دیوانگی کا عالم یہ تھا کہ قدم بوسی کرتی تو لگتا سر اٹھانا ہی بھول گئی ہوں۔

ہے جبیں میری زیارت گاہِ خلق
نقشِ پائے یار تیرا شکریہ!

بابِ کرم

ہمیشہ کی طرح وہی اداس اداس رات تھی۔
سسکتے سسکتے جانے کب مجھے نیند آ گئی تھی۔ میں اپنے بستر پر دونوں جہان سے بے خبر پڑی ہوئی تھی اور آسمان پر ایک فیصلہ ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔
میں ایک رہگزر پر کھڑی ہوں۔ میں اسٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ دور تک جاتی ہوئی لمبی سیاہ سڑک کو بار بار دیکھتی ہوں کہ کوئی سواری مل جائے۔ تبھی سامنے سے آتا ہوا ایک تانگہ نظر آیا جو میرے قریب آ کر رُکا۔ جس پر ایک بزرگ صورت شخص بیٹھے ہوئے مجھ سے بولے "کہاں جانا چاہتی ہو"؟
میں نے جواب دیا۔ "اسٹیشن"
انہوں نے تانگے والے سے کہا۔ "تانگہ فوراً اسٹیشن کی طرف موڑ دو"۔ اور پھر انہوں نے میرا ہاتھ تھاما، تانگہ پر بٹھایا، تانگہ چل پڑا، میں حیرت سے ان کا چہرا دیکھ رہی تھی۔ ان کی شخصیت کسی مقدس ہستی کا نشان لگ رہی تھی۔ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔
"اب تو تو خوش ہے نا؟"
"مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟"
"روزانہ میرے مزار پر آتی ہو، پہچانتی نہیں؟"

میں نے حیرت سے اُچھل کر کہا۔ ”آپ نظام الدین اولیاءؒ ہیں ؟“
اور ٹھیک اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور تھی۔
میں سوچ سوچ کر تھک گئی کہ آخر انہوں نے مجھے کس خوشی کی بشارت دی ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

ہاں اس خواب کے دوسرے ہی روز سے مجھے اپنے بچے شدت سے یاد آنے لگے۔ وہ کیا کھاتے ہوں گے، کیسے سوتے ہوں گے؟ دل کے جانے کس گوشے میں سوئی ہوئی ممتا جاگ اٹھی، اور میں ان کیلئے تڑپنے لگی۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے طویل عرصہ تک میں ان سے کس طرح جدا رہی۔ پہلے وہ مجھے اس طرح کبھی یاد نہ آئے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے دس مہینوں سے گہری نیند سو رہی تھی۔ ابھی ابھی آنکھ کھلی ہو اور بے چین ہو گئی ہوں۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی میں بمبئی پہنچ گئی۔ بمبئی شہر ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر آئی تھی۔ کچھ تو نہ بدلا تھا۔ نہ سڑکوں کی چہل پہل، نہ محفلوں کی رونقیں، ہمارے گھر کا منظر بھی ویسا ہی تھا، غم آلود، اداس اداس، ہاں بچے ضرور کچھ بدلے بدلے سے لگے۔ اب وہ میرے پاس آنے سے کتراتے۔ میں ان سے کسی کام کو کہتی تو نظر انداز کر دیتے۔ ان کے معصوم ذہنوں میں باپ کی غلط تربیت اور میرے خلاف نفرتوں کی سازش کامیاب تھی۔ میں سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی میں موقع پا کر انہیں زبردستی سینے سے لگا کو خوب روتی اور لگتا وہ بادل جو دس مہینوں سے نہیں برسا تھا اب ممتا کی آنچ میں پگھل رہا تھا۔ ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

شوہر نے کوئی باز پرس نہ کی، صرف یہ طعنہ دیا کہ۔
”کیا دنیا کے تمام دروازے تمہارے لئے بند ہو چکے ہیں کب تک میرے گھر سے چمٹی رہو گی؟“ اب انہیں کیا جواب دیتی کہ یہ بچے میرے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے ہیں اور انہیں کی محبت مجھے دوبارہ کھینچ لائی ہے۔ ورنہ اس جہنم میں کون رہ سکتا ہے جہاں صرف نفرت، ذلت، سیاست، مصلحت پسندی اور خود غرضی کی گھٹن ہو۔ میرا نصیب میرے

بچوں کے ساتھ کیوں جڑ گیا تھا؟ کیا دنیا کی تمام مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ شاید نہیں۔

مجھے ایسی مائیں بھی یاد ہیں جو اپنے سکھ کی خاطر بچوں کو باپ کے حوالہ کر کے نئی دنیا بسا لیتی ہیں۔ کئی ایسی مائیں بھی دیکھی ہیں جنہوں نے دوسری شادی کر کے بچوں کو ہوسٹل میں یا اپنے کسی عزیز کے یہاں پرورش کے لئے چھوڑ دیا۔ ان کی کفالت کی مگر اپنے ساتھ نہ رکھا۔ کیونکہ ان کی شوہر پرستی اور عیش و آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ بھی ماں تھیں۔ عورت تھیں۔ مگر میں کیسی عورت ہوں کہ زندگی میں کبھی اپنے عورت ہونے کا احساس تک نہ ہوا۔

بیٹی، بیوی، ماں، اور پھر صرف ماں رہ گئی۔ میری ممتا نے کبھی یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دی کہ زندہ رہنے کے لئے مسکرانا بھی ضروری ہوتا ہے۔!

جب دلی سے بمبئی کے لیے چلی تھی تو سوچا تھا تقدیر نے شاید میرے ہاتھوں میں نئی لکیر کا اضافہ کیا ہے۔ محبوب الٰہی" کا خواب میں آنا اور مجھے پیام خوشی دینا جانے کیسی کیسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر گیا تھا مگر یہاں تو کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہی گھٹن وہی اضطراب، وہی اذیت خانہ جس میں رہ کر لمحہ لمحہ سلگ رہی تھی۔ ہر وقت سوچوں کا عذاب مسلط رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کیا کروں، کہاں جاؤں؟ کسے اپنا دکھ سناؤں؟ کوئی تو نہ تھا جو میرے دکھوں کو بانٹ لیتا۔ سنا تھا غموں کی شدت میں جب ماں اپنے بچوں کو سینے سے لگا کر پیار کرتی ہے تو یہ بوجھ کافی ہلکا ہو جاتا ہے مگر یہاں بھی محرومیت تھی۔ سکون کے ہر در پر سخت پہرے تھے۔ بچے میرے پاس آنے سے کتراتے، باپ کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ بچے ہوں یا بڑے ہنستے، مسکراتے چہرے سب کو اچھے لگتے ہیں۔ وہ بھلا میری طرف کیوں راغب ہوتے؟

کبھی کبھی وہ لمحات بھی گزرے ہیں جب ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہوئے بچے اپنے باپ کے ساتھ ٹی وی وغیرہ کے کسی پروگرام پر قہقہے لگا رہے ہوتے اور اسی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ایک ماں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی رہتی۔ کوئی اتنا بھی نہ کہتا کہ آؤ تم بھی میری مسکراہٹوں میں شریک ہو جاؤ۔ میں اسطرح نظر انداز کر دی جاتی جیسے وہ مجھے دیکھ ہی نہ رہے ہوں۔ ان کے لیے میں نظر نہ آنے والی کوئی مخلوق بن کر رہ گئی تھی۔

ایسے گھٹتے ہوئے ماحول میں زندہ رہنے کا فیصلہ ایک روز پھر کمزور پڑ گیا۔ شدت غم سے نڈھال ہو کر اس رات میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کے صبح آئی تو خود کو تیز رفتار ٹرین کے روبرو کر دوں گی تاکہ پل دو پل میں کہانی ختم ہو جائے۔ مگر یہ صرف میری سوچ تھی، ارادہ تھا، فیصلہ تھا، ہم اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی کہانی کو ختم نہیں کر سکتے۔ کہانیاں تو ہمیں لکھ چکی ہیں لوح محفوظ پر۔

حالت اضطراب میں نیند آ گئی۔ اس رات خواب دیکھا کہ میں ایک ویران جنگل میں حیران و پریشان کھڑی ہوں۔ منظر ایسا ہے جیسے بارش ہو کر ابھی تھمی ہو۔ اونچے اونچے درخت اور پہاڑ سبھی پانی میں بھیگے ہوئے ہیں۔ میں چپ سی کھڑی تھی کہ کسی جانب سے آواز آئی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" یہ آواز انتہائی گونجتی ہوئی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ کون کس سے مخاطب ہے؟ دیکھا کہ آسمان پر فضا میں معلق دو چہرے آپس میں جڑے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

"نفیس پریشان ہے ہم اسے سنبھال رہے ہیں" اس وقت میرے دل نے کہا کہ یہ نظام الدین اولیاؒ اور پیر روشاہؒ (بمبئی کے ایک بزرگ) ہی ہو سکتے ہیں۔ اسی وقت دونوں چہرے غائب ہو گئے اور میں وہاں سے چل پڑی۔

دوسری صبح جب میں بستر سے اٹھی تو سورج کی پاکیزہ کرنوں نے میری ہستی کے گوشے گوشے میں اجالا بکھیر دیا تھا۔ اب وہ غم میرے لیے انتہائی مقدس تھا جس کی مسیحائی اللہ والے کر رہے تھے۔!!

اک کلی اس طرح سے پھول ہوئی

دل کے نہاں خانوں میں زخموں کی سجاوٹ اب بھی ویسی ہی تھی۔ وہ درد جو لاوا تھا آہستہ آہستہ میرے وجود کے گوشے میں اپنی ٹیس کو بڑھا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ دکھ کسی کو سنانے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر میری سننے والا کون تھا؟ نہ کوئی ہمدرد، نہ غمگسار، نہ ساتھی، نہ سہیلی، گھر کے در و بام میری سنتے تھے مگر درد بانٹ نہ سکتے تھے۔ میری سوچوں کو آخر ایک نئی راہ مل گئی۔

میں نے افسانے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنے غم کو معاشرے کے کرداروں میں بانٹ دیا۔ رات رات بھر کہانیاں لکھتی۔ میری سب سے پہلی کہانی "روح کا تاج" تھی جو بمبئی کے ایک رسالہ میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کے توسط سے ایک چہرا سامنے آیا اور اس چہرے سے کئی کہانیاں بنیں، اور ہر کہانی سمندر کی بے قرار لہروں کی طرح مجھے چھو کر گزر گئی۔ میں تو ایک خواب تھی۔ ایک پرچھائیں تھی۔ ہواؤں کی مانند گرفت میں نہ آنے والی ایک شئے تھی۔

تخلیقی سفر کا آغاز ہوا تو میرے شب و روز میں کچھ نئے انداز شامل ہوئے۔ جب اضطراب بڑھتا فوراً قلم تھام لیتی۔ جب میاں رات رات بھر گھر سے غائب رہتے تو آنسو بہانے کی بجائے نوکِ قلم پر جذبوں کا اظہار سمیٹ لیتی۔ جب کوئی کہانی مکمل ہوتی، مجھے لگتا میرے اندر سے کئی غم نکل کر کورے کاغذ پر بکھر گئے ہوں۔

انہیں دنوں میری ملاقات رابعہ اور شاہجہاں سے ہوئی۔ رابعہ میرے پڑوس میں رہتی تھیں اور شاہجہاں سے کسی تقریب میں تعارف ہوا تھا اور یہ تعارف دھیرے دھیرے دوستی میں بدل گیا۔ ایک دردمند انسان دوسرے کے درد کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ یہ دونوں بھی تقدیر کی ماری، اور بے حد دکھی تھیں۔ ہمارے درمیان دکھوں کا اشتراک ہی ایک پائیدار دوستی کا باعث بنا۔

جب رابعہ نے پہلی بار اپنی داستان زندگی سنائی تو اس وقت مجھے اپنا دکھ بہت چھوٹا لگا۔ رابعہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ ہم انہیں احتراماً رابعہ آپا کہتے تھے۔ وہ چھوٹے قد کی ہنس مکھ، بااخلاق اور قبول صورت عورت تھیں، اور اس تیس سال کی عورت پر صدیوں کے دکھ مسلط تھے۔

رابعہ نے بتایا کہ وہ آندھرا پردیش کے ایک گاؤں کے مِل مزدور کی بیٹی تھیں۔ ان کے گاؤں میں ایک چینی مل تعمیر ہو رہی تھی۔ جس کا بلڈر ایک غلط اوباش راجستھانی مسلمان تھا، جس کا نام عیسیٰ تھا مگر اعمال فرعون جیسا وہ ایک روز سات سالہ بچی کو اغواء کر کے بمبئی لے آیا اور اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں رکھا۔ خفیہ طور پر آتا جاتا رہا کیوں کہ اس کا خاندان بڑا تھا۔ بیوی، بچے، بہو، نواسے، نواسیاں، لوگوں کو پتہ چل جاتا تو سوسائٹی میں اس کا ایک اعلیٰ مقام تھا، چھن جاتا، سخت نگرانی اور پابندی کے ساتھ وہ بچی جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی، مسلمان کے گھر جوان ہوئی۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو عیسی ایک قاضی کو لے آیا اور بولا۔

"میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں"

وہ بہت روئی اور بولی۔

"میں نے تو آپ کو ہمیشہ باپ کی طرح سمجھا ہے آپ ایسا ظلم نہ کریں۔

مگر ظالم سوچتا کب ہے؟

پہلے لڑکی کو نہلا دھلا کر پر میلا سے رابعہ بنایا گیا۔ پھر نکاح ہو گیا۔ رابعہ نے بتایا کہ نکاح کے تین لفظوں نے میرے اندر جتنا زہر بھرا تھا کلمہ حق کے وہی تین الفاظ میری

زندگی بن کر میری روح میں اتر گئے۔ اب میں کلمہ گو تھی۔ مجھے لگا میری قید کے آٹھ سالوں نے میرے ہاتھوں میں رہائی کا پروانہ دے دیا ہو۔ ایک عجیب سی سرشاری محسوس کر رہی تھی۔ آٹھ سالوں میں گھر کا جو ماحول ملا تھا اس سے کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ روزہ، نماز، تلاوت قرآن پاک یہ سب دیکھتی تھی اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں نے گھر والوں سے تھوڑی تھوڑی اردو بھی سیکھ لی تھی اور ہندی میں چھپا ہوا قرآن بھی پڑھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

جب رات ہوئی یعنی سہاگ رات آئی۔ وہ ستر سال کا بوڑھا شخص شیروانی اور گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے، پان چباتا ہوا میرے پاس آیا۔ دل چاہا اس کا گلا گھونٹ دوں، مگر جب یہ خیال آیا کہ اسی شخص کی وجہ سے آج میں نے اسلام قبول کیا ہے تو میری نفرت کافور کی طرح غائب ہو گئی۔ میں نے اسی وقت بستر سے اٹھ کر شوہر کے قدموں کو چھو لیا۔ اس روز کے بعد میں نے ان سے کبھی نفرت نہیں کی۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ روزانہ شراب پی کر بدمست آتے اور کھانے کی تھالی میں پانی بھر کے قہقہے لگاتے۔

اس وقت بھی نہیں جب وہ فارس روڈ کی طوائفوں کو گھر میں لاتے اور مجھ سے کہتے۔ تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو، اور میں ایسا نہ کرتی تو میری پٹائی کرتے۔

مجھے حیرت اس بات پر ہوتی کہ جو شخص اپنی بیوی کے قابل نہ ہو وہ طوائفوں کو کس مقصد سے لاتا ہے اور وہ کیوں آتی ہیں؟

وہ کہتے۔ ”ارے پگلی یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں ہیں۔ ایسی باتیں صرف دولت مند عیاش سمجھ سکتے ہیں۔“

یہ کہتے کہتے رابعہ آپا رو پڑیں۔ میں تڑپ اٹھی۔ اے اللہ کاش! تو یہ دنیا نہ بناتا اور اگر دنیا بنائی تھی تو عورت نہ بناتا۔ کاش! جنت میں آدم کا دل بغیر حوا کے بہل جاتا۔ اے حوا تو نے عالم وجود میں آ کر قیامت تک کے لیے ہم عورتوں پر دکھوں کا پہاڑ توڑ دیا۔ کاش، ایسا نہ ہوتا۔

وہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی آنکھوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اولاد کی خواہش عورت کا فطری حق ہے۔ رابعہ آپا اس سے محروم تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ ان میں کوئی کمی تھی۔ وہ ہر طرح سے مکمل تھیں، اس کے باوجود وہ روحانی اور جسمانی راحتوں سے محروم ہو کر زندگی گزار رہی تھیں۔ میرے بچوں سے وہ بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ جب بھی میرے یہاں آتیں، بچوں کے ساتھ ان کا خوب دل لگتا۔ محسوس ہوتا شہر خموشاں میں زندگی رقص کرنے لگی ہو۔ اتنا سارا درد سمیٹ کر ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتیں۔ مجھے سمجھاتیں کہ آنسو بہانے سے کیا ہوگا؟ جو نصیب میں لکھ دیا گیا ہے اسے اپنی ڈیوٹی سمجھ کر انجام دو۔

یہ سچ ہے کہ رابعہ آپا نے میرے درد کو سراہا، زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا اور میری ایک اچھی اور غمگسار ساتھی ثابت ہوئیں۔!!

دکھ کا چہرہ کون پڑھے؟

میں ان میں سے تھی جو پتھر پر بیج بکھیر کر پھل کے منتظر ہوتے ہیں۔ مگر ایسا کوئی معجزہ نہ ہوا۔ غموں کا دریا اپنی رفتار سے بہتا رہا۔ مایوسیوں نے قدم پھر ڈگمگا دیے۔ تیسری بار خودکشی کی کوشش زندگی کو پھر شرمندہ کر گئی۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہوش آیا تو دیکھا اسپتال میں ہوں اور میرے سرہانے کھڑے ڈاکٹر پرامید نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور میری بے بسی ان سے پوچھ رہی تھی۔

"اے مسیحا یہ کیا کیا تو نے"؟

رفتہ رفتہ میری حالت سدھرتی چلی گئی، اور مجھے یاد ہے اس روز جب ڈاکٹر رضوی راؤنڈ پر آئے تو نرس کے ہاتھوں سے میری کیس فائل لے کر بڑے انہماک سے دیکھتے رہے اور پھر چشمہ کی سیاہ دبیز فریم سے جھانکتی آنکھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"زندگی سے اتنی بیزار ہو؟"

"زندگی مجھ سے بیزار ہے ڈاکٹر۔"

اس دن وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔ اگلے دن جب وہ آئے تو ان کے ہاتھ میں مولانا آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" تھی جس کا صفحہ نمبر ۲۷ کھلا ہوا تھا، مجھے تھماتے ہوئے بولے "ایک ڈاکٹر کی طرف سے مریض کے لیے تحفہ ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر"۔

اب میری نظریں ان سطور پر تھیں، لکھا تھا۔

”لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جایئے اور اس سے زیادہ مشکل کام نہ ہوا کہ زندہ رہیئے جس نے یہ مشکل حل کر لی اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا“۔

ڈاکٹر کا یہ بیش قیمت تحفہ جانے کب میرے ارادوں کو بدل گیا اور میں نے زندگی کے سب سے بڑے کام کو انجام دینے کا عہد کر لیا۔ فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی خودکشی کا تصور بھی نہیں کروں گی۔

اب غموں کی حفاظت کا سلیقہ آ گیا تھا۔ تنہائی میں روتی، سسکتی، لوگوں کے سامنے مسکراتی رہتی، کبھی کبھی لگتا میں منافق ہو گئی ہوں، کس کس طرح خود کو دھوکہ دے رہی تھی۔؟

ایک کے بعد دیگر غم سے بھری عورتیں میرے سامنے آتی گئیں۔ شاید یہ سب منجانب اللہ تھا۔ اور شاید اس لیے کہ مجھے یقین ہو جائے کہ میں اس دنیا میں تنہا دکھی نہیں ہوں۔

اس روز اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر روڈ کے اس پار دیکھا۔ بس اسٹینڈ کے قریب فٹ پاتھ پر ایک 22,20 سال کی لڑکی جو شکل و صورت اور لباس سے کسی اچھے گھرانے کی لگتی تھی، تین چار گھنٹوں سے یوں ہی خاموش اور اداس سی کھڑی تھی۔ یوں تو اس فٹ پاتھ پر پورا پورا خاندان بستا تھا مگر اس طرح کا چہرہ پہلی بار دیکھا تھا۔ بہر حال میں نے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس لڑکی پر نظر رکھی اور اس طرح رات ہو گئی۔ وہ ایک چادر بچھا کر زمین پر کھلے آسمان میں سر راہ لیٹ گئی۔

نہ جانے کیوں میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ جب کہ میری عادت ہے کہ میں کسی کے بارے میں کوئی تجسس یا کرید نہیں کرتی۔ مگر وہ لڑکی نہ جانے

کیوں مجھے الجھائے جا رہی تھی رات بھر نیند نہ آئی۔

صبح نوکر کو بھیج کر اسے بلوایا۔ اور پوچھا "تم دیکھنے میں کسی اچھے گھر کی لگتی ہو، یہاں فٹ پاتھ پر کیسے؟"

"دیدی میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"میرا نام جولی ہے۔ میں کلکتہ کی ایک عیسائی فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں ابھی گریجویشن کر رہی تھی کہ ایک لڑکے سے مجھے پیار ہو گیا۔ میں اس کی محبت میں اتنی دیوانی تھی کہ جیسا اس نے کہا میں کرتی چلی گئی۔ گھر سے روپے، زیور اور کئی قیمتی اشیاء لے کر میں اس کے ساتھ فرار ہو گئی۔ وہ مجھے بنگلور لے گیا۔ وہاں ہوٹل میں رکھا ہم ایک ہفتہ ساتھ رہے۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ایک رات ہوٹل کے کمرے میں مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آنکھ کھلی تو وہ غائب تھا۔ ایک اجنبی شخص آیا اور بولا۔"
تمہارے شوہر نے تمہیں بلایا ہے اس کے پیچھے پولیس ہے۔ فوراً میرے ساتھ چلو۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ جس عمارت میں مجھے لے جایا گیا وہاں کا ماحول ہی الگ تھا۔ پانچ چھ غنڈے میرے منتظر تھے۔ بولے۔ "اب تو یہاں سے کبھی نہیں جا سکتی۔ تیرے عاشق نے 25 ہزار میں سودا کر لیا ہے اور اب ہم تجھے کسی چکلے والی کے ہاتھ بیچیں گے"۔

ایک ہفتہ تک میں ان غنڈوں میں خیرات کی طرح تقسیم ہوتی رہی۔ اسی درمیان ایک موقع پا کر میں وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ ٹھکانہ کوئی نہ تھا۔ فٹ پاتھ پر رہنے والوں میں سہارا ڈھونڈا۔

وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "مگر یہاں پر رہنا تمہارے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ بمبئی ہے۔ یہاں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کا مقدر صرف طوائف کا کوٹھا ہوتا ہے۔"

"تو پھر آپ مجھے اپنے گھر میں رکھ لیں۔"

جواب میں میں خاموش ہو گئی۔ کیوں کہ اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنا بھی

دانشمندی نہیں تھی۔ میں نے کہا "میں تمہارے گھر کلکتہ تمہیں بھجوا سکتی ہوں، اور یہی تمہارے لیے مناسب ہے" وہ راضی ہو گئی اور دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

جب اگلے روز میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہ سامنے فٹ پاتھ پر نظر نہ آئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ دو تین عورتیں جو سامنے فٹ پاتھ پر رہتی تھیں، انہیں بلا کر معلوم کیا تو بولیں۔ "ہم سو رہے تھے، پتہ نہیں اس کا کیا ہوا؟ اسے کوئی اٹھا لے گیا یا وہ خود چلی گئی۔"

انسان کچھ سوچتا ہے!

اللہ کے فیصلے کچھ ہوتے ہیں!

مجھے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ کاش! ایک رات کے لیے اس بے سہارا لڑکی کو پناہ دے دی ہوتی تو وہ غائب نہ ہوتی لیکن اب صرف پچھتاوا تھا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مجھے اچانک ایک موڑ پر جولی مل گئی۔

"ہیلو دیدی! کیسی ہو؟ پہچانا؟"

کسی جواب کی بجائے میں حیرت زدہ سی کھڑی اس کا حلیہ دیکھتی رہی۔ پنسل ہل کے شوز، قیمتی سلک کی ساڑی، کانوں میں بڑی بڑی سونے کی بالیاں، لیدر کا پرس۔ بڑی دیر کے بعد میرے منہ سے نکلا۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں؟"

"دیدی میرے ایک رشتہ دار مجھے مل گئے اور مجھے اپنے جوہو کے فلیٹ پر لے گئے۔ انہوں نے ایک آفس میں میری سروس بھی لگوا دی۔ اب میں بہت خوش ہوں۔"

جولی کے چہرہ پر خوشی دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوئی۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں نے کچھ اور بھی کہا تھا جسے الفاظ دیتے ہوئے میں سہم رہی تھی۔

ایک سال بعد وہ مجھے پھر ملی۔ میں گرانٹ روڈ شاپنگ کے لئے جا رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز ٹکرائی۔

"دیکھ بھئی! اپن کا ریٹ فکس ہے کیا؟ پچاس روپے میں منگتا ہے تو بول؟"

"کاہے کو نخرے کرتی ہے پچاس روپے میں تو پانچ چھوکری ملے گی وہ بھی تیرے سے اچھا۔"

میں اتنا ہی سن پائی تھی کہ جولی کا چہرہ میرے سامنے آگیا وہ اپنا رخ دوسری طرف کر کے کھڑی ہو گئی اور میں انجان سی آگے بڑھ گئی مجھے لگا میرے کانوں میں کسی نے گرم گرم سیسے انڈیل دیے ہوں۔

اف !

یہ عورت ——— !

یہ مرد ——— !

یہ بازار ——— !

یہ قیمت ——— !

یہ سودا ——— !

یہ سب کیا ہے؟ عورت کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوچ نوچ کر مرد انہیں کب تک بیچتا رہے گا؟ عورت کے جذبات اس کے احساسات کو کب تک کچلتا رہے گا۔ یہ جسموں کے سوداگر اپنی دکان کب بند کریں گے؟ شاید کبھی نہیں۔ یہ بازار تو جانے کب سے کھلا ہے، شاید قیامت تک کھلا رہے گا!!

کہیں مسلی ہوئی کلیاں، کہیں روندے ہوئے غنچے
بہت سی داستانیں ہیں شبستانوں سے وابستہ۔!!

ساحل سے طوفان اٹھا

لمحہ لمحہ جھلسانے والی آگ اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔
میں اس شخص کو اب تک اپنے ذہن سے دور نہیں کر پائی تھی' جس نے مجھے درد کی نعمت عطا کی تھی' اور اپنے اس احسان سے خود نا آشنا تھا۔
وہ جس کا نام "م" سے شروع ہوتا ہے اور علمِ نجوم سے جس کا برج "اسد" ہے' اور جس کا مزاج آفتابی یعنی آتشی ہے' اپنی تمام صفات کے ساتھ میری دنیا میں آگ برسا رہا تھا۔ وہ آفتاب تھا اور میں زمین' لگتا تھا اسکی تمازت صرف میرا وجود جلانے کے لئے ہے۔ تمام شہر اس کی تپش سے محفوظ تھا مگر میں ہر پل سلگ رہی تھی۔ میرا پر بھی یقیناً یہی کیفیت گزری ہوگی جو یہ کہا ہوگا۔

جو میں ایسا جانتی پریت کئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت نہ کیجو کوئے

والدین نے میری شناخت کیلئے مجھے "نفیس" نام دیا۔ لیکن جب میرے ماضی اور حال کے جلتے تپتے شب و روز نے مجھے اپنے وجود میں بوند بوند کر کے اترتی آگ کا احساس دلایا تو میں نے اپنے نام کے ساتھ "شمع" کا اضافہ کر لیا۔
اور جب سے آج تک جل رہی ہوں۔ لگتا ہے میری تخلیق کے لئے مٹی بھی جہنم سے اٹھائی گئی ہو۔ اور اب یہ حالت ہے کہ مکمل آگ کے حصار میں ہوں۔

اب اس سے بڑھ کے بتا اور کیا سزا دے گا
میں اپنے جسم میں اک قید با مشقت ہوں

حالتِ اضطراب میں رابعہ آپا اور شاہجہاں میرا بہت خیال رکھتیں۔ مجھے زبردستی گھر سے باہر لے جاتیں۔ کبھی "جوہو بیچ" کبھی "مڈ آئی لینڈ" کے ساحل پر ادھر اُدھر کی باتوں سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ مجھے سمجھاتیں۔ اسے بھول جانے کا مشورہ دیتیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ محبت اختیاری نہیں ہوتی کہ کسی سے بھی ہو جائے اور جب جی چاہے بھلا دی جائے۔

رابعہ آپا کہتیں۔ یہ فقط تمہاری ضد ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی کام نہیں جو انسان کے اختیار میں نہ ہو۔ اس وقت میں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو جاتی اور سوچتی، اس میں رابعہ کا کوئی قصور نہیں۔ ساحل پر رہنے والے بھلا سمندر کی گہرائی کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں؟

مگر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بھی اس سمندر میں اتر گئیں۔ ابھی بیوگی کی عدت سے گزری ہی تھیں کہ ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ اسلم جو پچیس سالہ نوجوان تھا۔ آندھی کی طرح ان کی زندگی میں آیا اور مختصر عرصہ میں صدیوں کے فاصلے طے کر گیا۔

مجھے یاد ہے، اس روز آنسو بھری آنکھوں سے رابعہ آپا نے مجھ سے کہا تھا۔ "آج مجھے احساس ہوا کہ تم کتنی مجبور ہو"۔

دوسروں کو سمجھانے والی آج خود محبت کی قائل اور گرفتارِ محبت تھی۔ رابعہ کی صحرا جیسی زندگی میں اسلم بہار بن کر چھا گیا۔ حالاں کہ اسلم ان سے عمر میں پانچ سال چھوٹا تھا۔ کنوارا، خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھا، اور رابعہ سیاہ فام، موٹے اور بھدے خدوخال کی عورت تھیں۔ مگر کہتے ہیں نا کہ عشق یہ سب کچھ نہیں دیکھتا۔ مجنوں کو کالی لیلیٰ ہی بھائی تھی۔ اسلم نے اپنے والدین سے بغاوت کر کے رابعہ آپا کو شادی کی آفر کی، مگر جانے کیوں مجھے یہ بے جوڑ رشتہ شادی کے لئے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ محبت ایک روحانی بندھن ہے اور شادی ایک سماجی زنجیر، جس کی ہر کڑی سوچ سمجھ کر جوڑی جاتی ہے۔ میں نے رابعہ کو کئی بار

سمجھانے کی کوشش کی مگر اسلم کے پیار میں وہ بہت آگے نکل گئی تھیں۔ جہاں سے واپسی ان کے لئے ناممکن سی تھی۔ ان کے اٹل فیصلے کے آگے مجبور ہو کر آخر کار ایک روز میں ان کے نکاح نامے پر گواہ بن گئی۔

اسلم نے انہیں اپنے والدین سے الگ کرایہ کا مکان لے کر رکھا۔ اسلم رابعہ پر اس قدر نثار تھا کہ اس کا بس چلتا تو رابعہ کے پاؤں زمین پر نہ پڑنے دیتا۔ رابعہ بھی اسلم کی دیوانی تھیں۔ ان کا پیار دیکھ کر مرد کے بارے میں جو میرا نظریہ تھا اس میں تھوڑی لچک آگئی اور میں سوچتی لوگ سچ کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ رابعہ اور اسلم ہر اتوار کو ہمارے گھر آتے۔ ان کی ذہنی ہم آہنگی اور والہانہ پیار دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔ غموں کے کتنے پڑاؤ سے گزر کر آج انہیں ایک ایسا ٹھکانہ ملا تھا جہاں خوشیاں، آسودگی اور زندگی تھی۔ ہر وقت مایوس رہنے والی رابعہ آج جب بناؤ سنگار سے آراستہ ہو کر چہکتیں تو مجھے یقین نہ آتا کہ یہ وہی رابعہ ہیں۔

مرد کا پیار، بدصورت عورت میں بھی نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ اب ان کی آنکھوں میں نئی منزلوں کا نشہ تھا۔ ایک خمار تھا، جانے کتنے خواب تھے، وہ جب ہونٹ دبا کر مسکراتیں تو لگتا، ان سے خوشیاں سنبھالی نہیں جا رہی ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار دیکھ کر میں اپنے ماضی اور حال کی ساری چبھن بھول جایا کرتی۔ زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو خوش دیکھا تھا۔ کبھی کبھی یقین نہیں آتا تھا کہ مرد اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔

اب رابعہ اپنی گرہستی میں مصروف تھیں۔ مہینے میں ایک دو بار کبھی گھنٹہ بھر کے لیے آجاتیں۔ تنہائی نے مجھے پھر سے گھیر لیا تھا۔ بچے اسکول جاتے اور میں گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر کچھ وقت مطالعہ میں گزارتی، پھر پورے گھر میں بولائی پھرتی، وحشت، گھبراہٹ، بے چینی، زندگی عجیب محور پر رکی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کتابیں انسان کی بہترین دوست ہیں مگر ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ کہاں تک؟ اور کب تک؟ رات دن کے مطالعہ سے اب بینائی بھی کمزور ہونے لگی تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے۔ جب پہلی بار آنکھوں کے ڈاکٹر نے مجھے چشمہ کا نمبر دیا تو

میرے چہرے پر دیر تک ایک مسکراہٹ چپکی رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی تحفہ یا انعامی سرٹیفکیٹ ہو۔ جی ہاں! میں دنیا کی شاید پہلی عورت تھی جسے بینائی کمزور ہونے کا سن کر ایک روحانی مسرت ہوئی تھی میری ایک دوست نے اس وقت پوچھا تھا۔

"تم کیوں مسکرا رہی ہو"؟

میں اسے کیا بتاتی کہ میری اس مسکراہٹ سے ایک ایسی کڑی جڑی ہوئی ہے جسے ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ صرف میں ہی جانتی تھی کہ میں ہر معاملہ میں اس کی تقلید کرتی تھی۔ بس چشمہ لگانے سے مجبور تھی کیوں کہ میری بینائی تیز اور اچھی تھی مگر یہ حسرت بھی پوری ہو کے رہی۔

زندگی بھر زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
آدمی جب تک محبت آشنا ہوتا نہیں ——!!

شاخ شاخ پھولوں کا زخم

ان دنوں میری صحت گرتی جارہی تھی۔ چکر، بخار، متلی، اور کبھی کبھی پیٹ میں شدید درد اٹھتا۔ میڈیکل رپورٹ کے بعد پتہ چلا کہ مجھے Appendix ہو گیا ہے اور آخری مراحل میں ہے۔ 24 گھنٹے کے اندر آپریشن نہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ میں اسپتال میں ایڈمٹ ہو گئی۔

صبح آپریشن تھا۔ میرے بیڈ کے پاس میری چھوٹی بہن انجم اور نکہت میرے بہنوئی لطیف اور میرے بچے کھڑے میری زندگی کے لئے دعائیں کر رہے تھے۔ ان کے چہرے اُداس تھے مگر میں مطمئن تھی۔ مجھے کوئی ڈر، خوف نہ تھا کیوں کہ بقول خمار بارہ بنکوی۔

مرنے کا ڈر انہیں ہو، جو زندہ ہیں اے خمار
مجھ کو تو موت آئے زمانے گزر گئے

آپریشن ہو گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد اپنے بستر پر ہوش آیا تو دیکھا، میرے بہنوئی ہاتھوں میں گلاب کے تازہ پھولوں کا تحفہ لیے کھڑے تھے۔ مجھے لگا ساری دنیا چمن ہو گئی ہو۔ کاش ایسے ہی میں روز بیمار رہوں۔ اور لوگ میری عیادت کو آئیں، میرے لیے پھول لائیں۔ میرا حال پوچھیں۔ میرے پاس بیٹھیں۔ تنہا رہتے رہتے اس قدر بیزار ہو چکی تھی کہ اب اسپتال کے وارڈ میں کراہتے ہوئے مریض مجھے اچھے لگتے۔ لگتا وہ سب میرے دکھوں میں برابر کے شریک ہیں۔ میرے برابر والے بیڈ پر ایک روزی نام کی لڑکی تھی، دبلی پتلی،

کمزور اور کمسن سی، زیادہ سے زیادہ بیس سال کی، اس کا آپریشن ہوا تھا مگر اس سے ملنے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ کئی بار میرے ذہن نے سوچا کیا اس کا دنیا میں کوئی نہیں؟ کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ تنہا ہے، آخر کوئی تو ہوگا؟ وہ میری طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی، شاید یہ سوچتی ہوگی، میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ صبح و شام کتنے سارے لوگ میری عیادت کو آتے ہیں۔

ڈاکٹر جب پوچھتے۔ How are you? تو وہ ہلکے سے مسکرا کر صرف Fine کہتی اور ڈاکٹر اگلے مریض کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو نمی اترتی، وہ ڈاکٹر، نرس، مریض سب سے پوشیدہ رہتی لیکن میری نظریں اسے چھو لیتی تھیں۔ کیوں کہ میں بھی اسی دشت کی سیاح تھی۔

ایک روز ہمت کر کے میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"روزی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی نہیں؟"

"کیا بتاؤں میں آپ کو، بہت دکھی لڑکی ہوں۔" روزی نے کہا۔

"اب سے چند سال پہلے کی بات ہے، بمبئی اندھیری کے علاقہ میں ہمارا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں میری ماں، میں اور چھوٹا بھائی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے ڈیڈی ایکسپائر ہو چکے تھے۔ ممی مقامی کالج میں لیکچرر تھیں۔ بھائی اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بی اے فرسٹ ایئر میں۔ میرے ڈیڈی مہاراشٹر کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے وہاں پر ہمارے ناریل کے بہت سارے باغ، کھیت اور مکانات تھے جسے ہمارے بڑے انکل سنبھال رہے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کے تمام فتنوں کی جڑ زن، زر اور زمین ہے۔ ہماری جائیداد ہڑپ کرنے کے لئے چاچا نے ایک پیشہ ور قاتل سے ایک روز میری ماں، اور بھائی کو قتل کروا دیا۔ اس وقت میں گھر سے باہر تھی، بچ گئی۔ یا یوں سمجھیں کہ میری زندگی باقی تھی۔ ماں کے بعد میرا کوئی سرپرست نہیں۔ میں بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ میں اب کالج کے ہوسٹل میں رہتی ہوں اور اکیلی ہوں۔" جملہ پورا کرتے کرتے روزی نے رومال اٹھایا اور اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ جذب کرنے لگی جو کمزوری کے باعث آ گیا تھا۔ تھوڑے توقف

کے بعد وہ پھر بولی۔

"اور آپ جانتی ہیں، میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ایسا کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ مجھے ہر مرد کی شکل میں میرا چاچا نظر آتا ہے۔ ہر مرد مجھے بے رحم، قصائی، قاتل اور خود غرض معلوم ہوتا ہے۔"

روزی بے حد جذباتی ہو رہی تھی، آواز بھرائی ہوئی روہانسی مگر آنکھیں ایسی جیسے دریا خشک ہو گیا ہو۔ سارے کے سارے آنسو پتھر بن کر آنکھوں میں جم گئے ہوں۔

"روزی سارے مرد ایک جیسے تو نہیں، مگر ہر عورت کا نصیب ضرور ایک جیسا ہوتا ہے۔" میں نے روزی کا ہاتھ تھاما اور موڈ بدلنے کے لیے اسے بالکونی میں لے آئی جہاں تازہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں نے ذہن کی آلودگی کو دھو دیا۔ ہر دکھی عورت مجھے متاثر کر لیتی ہے۔ میں اس کے غم کو اپنا غم تصور کرنے لگتی ہوں۔ روزی سے بھی مجھے بے حد ہمدردی ہو گئی تھی۔ دن بھر اپنے اپنے بیڈ پر لیٹے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ اور رات آتی تو نرس کے ہاتھوں دواؤں کی کڑوی خوراک لے کر نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں آنکھیں موند کر اپنے اپنے دکھوں کے شمار میں لگ جاتے۔

میرے مشاہدے میں اب تک مرد کی جو تصویر آئی تھی وہ اب بڑی تیزی سے نوکِ قلم پر ابھر رہی تھی۔ میری کہانیاں، افسانے پڑھ کر قارئین اکثر مجھے برا بھلا کہتے کہ میں مرد کے خلاف کیوں لکھتی ہوں؟ اس میں میرا کیا قصور، ایک ادیب جو دیکھتا ہے، سنتا ہے، جو محسوس کرتا ہے وہی لکھتا ہے اور جو باتیں میرے ذاتی تجربے میں آ رہی تھیں وہ احاطۂ تحریر میں کہاں آسکتی ہیں؟ ان کے بیان کے لیے تو صدیاں درکار ہیں، یا یوں سمجھ لیں کہ کچھ حادثوں کو میں دانستہ نظر انداز کر رہی ہوں۔!!

عورت پھر ہار گئی

ایک دن وہ گھڑی بھی آ گئی، جو مرد کے تئیں تھوڑا اعتماد قائم ہوا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس روز رابعہ آپا پورے چار ماہ بعد مجھ سے ملنے آئیں۔ وہ کافی عرصہ اپنی سسرال ملیح آباد میں رہ کر بمبئی آئی تھیں۔ بے حد تھکی تھکی سی، نڈھال اور اداس۔

''کیا ہو گیا آپ کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

جواب میں وہ میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''کچھ تو بولیئے'' میں پریشان ہو گئی۔ غم کی گھٹا جانے کب تک برستی رہی۔

بڑی دیر بعد انہوں نے بتایا کہ اسلم نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ان کی غیر موجودگی کے ان تین چار مہینوں میں پڑوس کی 14 سالہ کمسن لڑکی جو انتہائی خوبصورت تھی اور اسلم کو ماموں کہتی تھی۔ وہ ایک لکڑی بیچنے والی غریب عورت کی بیٹی تھی۔ اس کے گھر والوں نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ اور اب وہ اس سے نکاح کر کے اپنے گھر لے آیا تھا۔

''اب میں کیا کروں'' رابعہ آپا بے بسی کے عالم میں مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

میں انہیں کیا جواب دیتی سوائے اس کے کہ صبر کریں جو کہ عورت کا پیدائشی حق ہے۔

ان کا انتخاب آج ان کی بد نصیبی بن کر سامنے آیا تھا۔ رابعہ آپا کی حالت دیکھ کر میرا جی چاہا، کاش کہیں سے پستول مل جائے اور میں دنیا کے تمام مردوں کو گولی مار دوں۔ لکھنؤ کی شمیم رحمانی کی طرح جس نے برسوں پہلے اپنے بیوفا محبوب ڈاکٹر گوتم کے جسم کو

گولیوں سے چھلنی کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دیا تھا۔ یا میں پھولن دیوی ہوتی۔ جس نے چن چن کر ہر ایک سے اپنی بربادیوں کا بدلہ لیا تھا۔ لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ تن پر شرافت کا لبادہ اوڑھے من کے زہر کو گھونٹ گھونٹ پیتی رہی۔

رابعہ آپا نے جب اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور اپنی سوتن کے ساتھ رہنا بھی گوارا کر لیا تب اس بیوفا ظالم شخص نے انہیں یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ میری بیوی نہیں چاہتی کہ تم سے تعلق رکھوں اور میں اس کی چاہت میں مجبور ہوں۔

رابعہ آپا اب میرے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ میرے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، مگر جانے کیوں وہ اپنے آپ کو مجھ پر ایک بوجھ سمجھ کر رات دن فکر مند رہا کرتیں۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی معقول ملازمت بھی نہ مل سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی ایک واقف کار عورت نے ایک ایجنٹ کے ذریعہ انہیں مدینہ منورہ کے اسپتال میں بہ طور نرس بھجوا دیا۔

آرزوئیں جب انسانی در سے پامال ہو جائیں تو حق کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بڑھ کر سہارا دیتی ہیں۔ ایک مرد نے کیا ٹھکرایا کہ کائنات کے شہنشاہ نے اپنے حصار میں لے لیا۔ اپنے شہر میں پناہ دی۔ اپنے قریب بلا لیا۔ اسپتال کے ہوسٹل کی کھڑکیاں روضۂ رسول ﷺ کی جانب کھلتی تھیں۔ ایک مومن کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

رابعہ آپا کے جانے کے بعد میں بالکل تنہا ہو گئی۔ اب نہ کوئی درد سننے والا تھا، نہ تسلی دینے والا، میری چھوٹی بہن انجم ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر بیاہی تھی۔ وہ کبھی کبھی آ جاتی، یا ہم چلے جاتے، چند لمحوں کے لیے دل بہل جاتا۔ پھر وہی وحشت وہی تنہائی کا کرب ہوتا۔!!

محبت سے محبت تک

اب کے میری مسیحائی کیلئے اللہ نے سید صاحب کو بھیج دیا تھا۔ سید صاحب ایک بزرگ صوفی تھے۔ عمر تقریباً 80 سال نابینا مگر باطن روشن تھا۔ مجھ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ بالکل بیٹی کی طرح، مجھے بھی ان سے بہت عقیدت تھی۔ وہ میرے پیرو مرشد کے دادا صوفی احمد حسن شاہؒ کے خلیفہ تھے۔

اہل سلسلہ ہونے کی وجہ سے میرا ان سے مضبوط رابطہ ہو گیا۔ وہ انتہائی مخلص، غریب پرور، متقی، پرہیزگار اور باطنی علم رکھتے تھے جس کا مشاہدہ میں کئی موقعوں پر کر چکی تھی۔ چوں کہ، راز کی حفاظت کرنا انسانی فرض ہے لہٰذا میں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اسے پردۂ غیب میں رکھا کبھی کسی سے کچھ نہ کہا۔

مجھے یاد ہے، وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور کا ایک المیہ اکثر مجھے سنایا کرتے اور میں بڑے انہماک سے سنتی تھی۔

وہ بتاتے تھے کہ جب وہ اٹھارہ سال کے تھے تو ان پر ایک لڑکی عاشق ہو گئی مگر ان کا دل کبھی اس کی جانب مائل نہ ہوا۔ کافی عرصہ گزر گیا اور لڑکی جب اظہارِ تمنا کر کے تھک گئی تو ایک روز اس نے دھمکی دی کہ اگر میری محبت قبول نہ کی تو جان دے دوں گی، اور ایک دن سچ مچ اس نے اپنے بدن پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگالی۔ زیتون جل کر خاک میں مل گئی مگر سید صاحب کے لئے ایک ایسی چنگاری چھوڑ گئی جو دھیرے دھیرے شعلہ بنتی گئی۔

زیتون ان کے ہوش و حواس پر مسلط ہو گئی — ایک پتھر کے اوپر ایسا درخت اگا جس کی شاخیں وجود کے کونے کونے میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔

زیتون کی زندگی میں جس شخص نے اس پر کبھی نظر التفات نہ کی وہی شخص اب اسکی قبر پر مستقل بیٹھ کر آنسو بہا رہا تھا۔ یہ آنسو پشیمانی یا پچھتاوے کے نہ تھے بلکہ اس محبت کے تھے جس کی ڈور کا مضبوط سرا ان کی روح کو جکڑ چکا تھا۔

زیتون کی قبر پر روتے ہوئے کئی ماہ گزر گئے تو ایک رات انہیں بمبئی کے ایک بزرگ کی بشارت ہوئی کہ یہاں آ جاؤ۔

چند ہی دنوں بعد سید صاحب کلیان کے حاجی ملنگ پہاڑ پر پہنچ گئے۔ حاجی ملنگؒ کے آستانے پر حاضری کے بعد ان کے حالات میں تغیر پیدا ہوا اور یہیں سے ان کے ایک مبارک روحانی سفر کی شروعات ہوئی۔ کھونے اور پانے کا سلسلہ جاری رہا تقدیر کی خانہ پری ہوتی رہی۔ کئی سال گزر گئے۔

زیتون کا عکس اب بھی ان کی ذات کے درپن میں موجود تھا اب وہ دُور دُور تک ایک نوجوان مجذوب کے روپ میں جانے جاتے۔ ان کے ارد گرد عقیدت مندوں کی لمبی قطار ہوتی۔ مگر وہ تمام ہجوم سے بے نیاز سر جھکائے ایک ہی مقام پر بیٹھے رہتے۔ انہیں دنوں بمبئی فلم انڈسٹری کی مشہور و معروف اداکارہ راج کماری اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ حاجی ملنگؒ کے آستانے پر حاضری دینے آئی تو سید صاحب کے بارے میں سن کر اسے بھی ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور سات پیروں والی پہاڑی کے دامن کے ایک غار میں بیٹھے ہوئے اس نوجوان مجذوب کے پاس پہنچی۔ بے حد ادب و احترام سے دوزانو ہو کر چند لمحوں تک بیٹھی رہی، کچھ پوچھا کچھ کہا اور پھر نظریں عقیدت سے جھکا لیں۔ راج کماری نے تو عقیدت سے صرف سر جھکایا تھا مگر جانے کب جانے کن لمحوں میں دل کا ایک عالم سجدہ ریز ہوتا چلا گیا۔

راج کماری بے حد فرقہ پرست، مغرور اور ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ مگر لوگوں نے دیکھا کہ باطل اور غرور کا بت ٹوٹ ٹوٹ کر ایک پاکیزہ جذبہ کے سامنے فنا ہو گیا۔

راج کماری سید صاحب کے روبرو زمین پر پیشانی ٹکائے اپنی زندگی کی بھیک مانگ

رہی تھی۔ "مجھے اپنا لیجئے، میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

سید صاحب نے کہا "راج کماری، میں ایک فقیر آدمی ہوں، میرا تعاقب نہ کرو۔ لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں۔"

سید صاحب نے اسے نہایت نرمی اور پیار سے سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر اٹل رہی اب دل کی دھڑکنیں اس منزل پر تھیں جہاں کوئی لیلیٰ کسی دیوار سے روکی نہیں جاسکتی۔ عشق کا دریا جب بہتا ہے تو بڑے بڑے پہاڑ کو بھی اکھاڑ پھینکتا ہے۔ آخر کار ایک دن راج کماری کا عشق بھی رنگ لایا اور عشق کے ایک دریا سے گزر کر وہ بڑے سمندر میں اتر گئیں۔ سید صاحب نے ان کو اپنے نکاح میں لینے کا وعدہ کرلیا۔ مگر ان شرطوں پر کہ وہ فلم انڈسٹری اپنی دولت وجائیداد کو چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں گی دیگر یہ کہ ان کے ساتھ فقیرانہ زندگی بسر کریں گی۔ گھربار عیش و آرام، اولاد سے محروم رہنا پڑے گا۔

اور۔!

راج کماری نے یہ ثابت کردیا کہ محبوب سے بڑھ کر دنیا کی کوئی شئے نہیں، کوئی رشتہ نہیں۔ شہرت، دولت، مذہب ایک روز سارے بندھن سے آزاد ہوکر وہ سید صاحب کی زوجیت میں آگئیں۔

گھاٹ کوپر کی غریب بستی میں ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ اب وہ دونوں اپنی اپنی روحانی منزل طے کر رہے تھے کچھ ہی عرصے بعد ایک صاحب کے ذریعہ ان کی رسائی بھینسوڑی شریف کے ایک بزرگ حضرت صوفی احمد حسن شاہؒ تک ہوگئی اور وہ دونوں ان سے بیعت ہوگئے۔ پیتل سے سونا اور سونے سے کندن بننے تک کا مرحلہ بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ ان تمام مشکل راستوں سے گزر کر سید صاحب اب اس منزل پر تھے جہاں ہونٹ سی دیے جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی، کہیں کہیں سے راز کے بھرے جام چھلک جاتے۔ اس وقت میں انہیں حیرت سے دیکھتی اور سوچتی اتنی عظیم شخصیت میرے گھر میں ہمارے قریب اور ہم پر اتنی مہربان یہ ہماری خوش نصیبی تھی۔

کہتے ہیں کہ جب کسی ولی اللہ کا وصال قریب ہوتا ہے تو اس سے کرامتیں ظہور

میں آتی ہیں۔ اور یہ کرامت ہمارے سید صاحب سے بھی ہوئی مگر افسوس کہ اس وقت یہ باتیں ہمارے فہم وادراک سے بالا تھیں۔

وصال سے ایک ہفتہ قبل وہ ہمارے یہاں تشریف لائے۔ ہمیشہ کی طرح خوشبوؤں میں رچے بسے، نورانیت سے بھرا چہرہ، خلوص میں ڈوبی آواز، بچوں کو بلایا ہمیشہ کی طرح سر پر دستِ شفقت رکھا۔ مستقبل کے سلسلے میں مجھے چند ہدایات کیں۔ میں رونے لگی تو میرے آنسو اپنے مقدس رومال میں جذب کر لیا اور فرمایا۔ "آج سے ایک ہفتہ بعد میں ہمیشہ کے لیے جارہا ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گا"۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مگر کہاں؟"

فرمایا۔ "بغداد شریف کے لئے میرا ویزا مل گیا ہے۔ اب میں وہیں رہوں گا۔"

"واپس کب آئیں گے؟"

"پگلی کہیں کی، وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"اس لیے کہ وہ بہت اچھی جگہ ہے۔"

پھر میں نے روتے ہوئے کہا کہ آج میں پہلی بار سن رہی ہوں کہ بغداد شریف جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ آپ مجھ سے مذاق کیوں کر رہے ہیں؟

"دیکھو بیٹی بغداد جانے تک اس بات کو کسی سے نہ کہنا۔"

اور پھر آخری بار وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چلے گئے اس بار میں بہت دور تک انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ٹھیک ایک ہفتہ بعد اچانک خبر ملی کہ سید صاحب کا انتقال ہو گیا۔ میں نے تڑپ کر کہا "ہاں وہ بغداد چلے گئے۔ وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا"۔

حالتِ نماز میں ان کا وصال ہوا تھا۔ ان کی بیوی نے لوگوں کو بتایا کہ وہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول وہ چائے کا پیالہ لے کر آئیں تو ان کی پشت کی طرف رخ تھا۔ انہوں نے نہ جانے کس کے سلام کا جواب دیا "وعلیکم

السلام ‘‘اور پھر سجدے میں چلے گئے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور انہیں اٹھایا تو پتہ چلا کہ وہ معبود حقیقی سے جاملے تھے۔

سید صاحب کے انتقال کا غم بہت شدت اختیار کر گیا۔ میں ہر وقت روتی رہتی۔ ایسا لگتا سر سے ایک سائبان اٹھ گیا ہو۔ ان کی تمام شفقتیں، محبتیں، عنایتیں یاد آتیں تو دل کٹنے لگتا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس غم کو کس طرح برداشت کیا۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن محسوس ہوتا ہے میرا ہر قدم ان کی رہنمائی میں اٹھ رہا ہو۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ سوچیں کہ میری سوانح عمری آپ بیتی کم جگ بیتی زیدہ ہے تو اس سلسلے میں عرض کر دوں کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے بالکل کورا، سادہ اور اس پانی کی طرح ہوتا ہے جس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ زمانے کے رنگوں سے زندگی کا خاکہ بھرتا ہے، ایک ایک رشتے سے ایک ایک کہانی بنتی ہے۔ آپ ہی بتایئے جو لوگ ہماری شخصیت کے اندھیرے اور اجالے کے بانی ہوں انہیں بھلا کیسے بھلایا جا سکتا ہے؟

اور یوں بھی ہر واقعہ میں ایک عبرت ہوتی ہے اگر ہم اس پر غور کریں۔!!

بے وفا باوفا نہیں ہوتا

ہمارے محلے کے ایک شخص نے اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے اس لئے مار ڈالا کہ وہ ہر بار لڑکی ہی پیدا کرتی تھی اور اسے لڑکے کا شوق تھا۔

ہر عورت کی کہانی جیسے اپنی کہانی ہو۔

برسوں بیت گئے ہیں مگر ہر واقعہ ذہن میں یوں تازہ ہے جیسے ابھی ابھی کی بات ہو۔ مجھے ایک وہ شوہر بھی یاد ہے جس نے اپنی دوسری بیٹی کی پیدائش پر بیوی کا گلا تو نہیں گھونٹا ہاں اس کی روح کے دامن کو تار تار ضرور کیا تھا۔ جیسے ہی نرس نے اطلاع دی کہ بیٹی ہوئی ہے۔ بغیر کچھ کہے سنے وہ اسپتال سے چلے گئے اور پھر پورے سات دن تک وہ بیوی جس نے بیٹی پیدا کی تھی اسپتال میں تنہا پڑی ماں بننے کی سزا جھیلتی رہی۔

دو بیڈ کا پرائیوٹ روم تھا۔ برابر والے بیڈ کی عورت کو لڑکا پیدا ہوا تھا، اس کے ارد گرد ہر وقت رشتہ داروں کا ہجوم رہتا۔ شوہر تو اس پر اس طرح نثار تھا جیسے وہ پہلی بار باپ بنا ہو۔ وہ اپنے چار بچوں والی بیوی کے سرہانے بیٹھا کتنے پیار سے اسے کھلاتا پلاتا۔ کبھی سر پر اسکارف درست کرتا کبھی اس کے بالوں میں کنگھی کرتا اور جاتے جاتے کئی بار اسے مڑ کر دیکھتا۔ دن میں دو تین بار اس کی خیریت کے لیے ریسپشن پر فون کرتا۔

اور میں اس عورت کے نصیب پر رشک کرتی جس کے شب و روز پر ایک باوفا مرد کا بھرپور پیار محیط تھا۔

محرومیت کا احساس زندگی کو کھوکھلا کیے جا رہا تھا۔ وہ وقت بھی بھوں نہیں جب دو بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا۔ گمان تھا کہ اس بار شاید تھوڑی بہت قدر ہو جائے گی مگر ایسا تب بھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس کی دنیا میں عورت سے محبت کا کوئی تصور نہ تھا۔ بنیادی مقصد صرف بچے پیدا کرنا اور بستر پر پہلو گرمانا تھا۔ اس کا دل فولاد کی طرح سخت تھا۔ اس آہنی انسان سے ٹکرا ٹکرا کر آرزوئیں جانے کب تک لہولہان ہوتی رہیں۔

بے وفا باوفا نہیں ہوتا
ختم یہ فاصلہ نہیں ہوتا

یوں جوانی شہید ہوتی رہی

ایک روز میری ایک دوست شاہجہاں نے جو رابعہ کے بعد میری غمگسار بنیں، کہا تھا۔ ''نفیس! اگر دنیا میں خوش رہنا ہے تو بے حس بنو، بالکل میری طرح۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ جانے کیوں اس وقت میں نے شاہجہاں کو دیکھا۔ جدید طرز کے عمدہ لباس میں ملبوس، میک اپ سے آراستہ، گلے میں قیمتی ہیرے کا ہار، انگلیوں کی تعداد سے زیادہ انگوٹھیاں، کانوں میں جھولتے ہوئے ڈائمنڈ کے بیش قیمت بندے اس بات کے غماز تھے کہ وہ بہت خوش ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک عورت نے کتنے سلیقے سے اپنے غموں کو ہیرے جواہرات سے ڈھانپ رکھا تھا۔ لوگ اسے زندہ دل، ہنس مکھ اور چنچل کہتے تھے۔ ہر محفل میں لوگوں کا دل بہلانا، روتی ہوئی آنکھوں کو ہنسا دینا، یہ اس کا خاص فن تھا۔ اس کا سراپا ہر زاویہ سے زندگی کی مکمل تصویر لگتا تھا۔ مگر یہ تو وہی جانتی تھی کہ وہ لحہ لحہ آنسوؤں کو پیتی ہے۔

تیس سال کی عمر میں تین شادیاں کرنے والی یہ عورت غلط نہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں تو مرد کے لیے بڑی وسعت ہے لیکن عورت کے لیے دوسری تیسری شادی کا تصور ہی غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی عورت کو شوق نہیں ہوتا کہ وہ مختلف بستر دل کی زینت بنے، مرد کی کمزوری اگر عورت ہے تو عورت کے لئے بھی سب سے بڑا سہارا مرد ہوتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر عورت کو طلاق دینا آج کل مرد کے لیے فیشن بن گیا

ہے۔ اگر عورت دوسری شادی نہ کرلے تو کیا کرے۔ سماج میں اسے تنہا بھی تو نہیں رہنے دیا جاتا۔

شاہجہاں کی پہلی شادی بارہ سال کی عمر میں ایک بوڑھے تاجر سے کر دی گئی جو عمر میں اس سے چالیس سال بڑا تھا۔ چوں کہ اس وقت وہ بہت کمسن اور ناسمجھ تھی، والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ تنہا اور بے سہارا تھیں۔ غربت کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے والدہ کو غریبی سے ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس شخص سے کریں گی جس کے پاس بے انتہا دولت ہو گی۔ شاہجہاں نے بتایا کہ میری ماں کا خواب پورا ہو گیا مگر جب پہلی رات کو میرے شوہر نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا تو میرے اندر البتہ کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ میرے شوہر کا چہرہ غصہ سے تمتمایا ہوا تھا۔ وہ بار بار میری والدہ سے یہی کہہ رہے تھے۔ "آپ نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے مجھے معلوم ہوتا کہ لڑکی اتنی کم عمر ہے تو میں کبھی شادی نہ کرتا۔"

رفتہ رفتہ میں سن شعور کو پہنچ گئی۔ چار سال گزر چکے تھے مگر میرے شوہر اب تک مجھ سے دور دور رہتے تھے۔ مجھے ان کا جملہ آج بھی یاد ہے جب شادی کی رات انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "میں ساری زندگی تجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔"

وہ مجھے اچھے کپڑے پہناتے۔ میرے کھانے پینے سے لے کر سیر و تفریح تک کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ بہت خوش تھی ان کے ساتھ۔ وہ مجھے بالکل باپ جیسی شفقت دیتے۔ میں روٹھ جاتی تو مناتے۔ روتی تو میرے آنسو پونچھتے۔ کوئی غلطی کرتی تو سمجھاتے۔

جب میں سولہ سال کی ہوئی تو ایک دن میرے شوہر نے میرے کان میں کہا۔ "شاجو میں نے تیرے لئے ایک لڑکا دیکھا ہے۔ چاہتا ہوں تمہاری والدہ سے مشورہ کر کے تمہاری شادی کر دوں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کیا پتہ زندگی کب ساتھ چھوڑ دے؟"

اور میں اس شخص کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے مجھے کوئی گندی سی گالی دے دی ہو۔ اس سے آگے میں نے کچھ نہیں سنا۔ اپنے خاوند کے شانوں پر سر رکھ کر زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ رات گئے تک وہ مجھے سمجھاتے رہے، بہلاتے رہے کہ میں شادی کے

لیے راضی ہو جاؤں لیکن میں تھی کہ ایک ہی رٹ لگائے تھی۔

"میری شادی تو آپ سے ہوئی ہے۔"

"نہیں پگلی، یہ تو صرف دنیا کی نظر میں، میں تجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔"

اب خاوند کی بات دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اب میں بچی تو نہ تھی۔ سولہ سال کی عمر جذبوں کی زبان سمجھنے لگتی ہے۔ آخر کو میں بھی نئی نئی فلمیں دیکھتی تھیں، رومانی ناول پڑھتی تھی۔ بات اب دھیرے دھیرے سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ واقعی میرے شوہر ہوتے تو کیا ہم الگ الگ پلنگ پر سوتے۔ فلموں میں تو میاں بیوی ایک ساتھ سوتے ہیں نا؟

"تو پھر میرا آپ سے کیا رشتہ ہے؟" میں نے تڑپ کر پوچھا تھا اور انہوں نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"شاجو کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو انسانی فہم سے اونچے ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی نام نہیں دیا جاتا۔"

میری والدہ کے منع کرنے اور سمجھانے کے باوجود ایک روز میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح میری والدہ میری شادی کسی مناسب شخص سے کر دیں گی۔

میں نے شاہجہاں سے پوچھا۔ "تو کیا آپ کی شادی اسی لڑکے سے ہوئی جو آپ کے شوہر نے طے کی تھی؟"

"نہیں جذبوں کی قتل گاہ پر ایک بار پھر جوانی شہید ہو گئی۔ میری والدہ نے اس لڑکے سے شادی اس لیے نہیں کی کہ وہ میرے پہلے خاوند کی طرح امیر نہ تھا۔"

شاہجہاں بولے جا رہی تھی تھوڑے دنوں بعد بڑے اہتمام کے ساتھ ایک رئیس مگر بوڑھے شخص سے منسوب کر دی گئی۔ شہر میں اس کے کئی شوروم، ہوٹل اور مختلف کاروبار تھے۔ بیوی اور جوان بیٹے بیٹیاں پہلے سے موجود تھے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص دولت مند ہو اور بیٹی بہو کے ہوتے ہوئے دوسری شادی

کرے وہ بھی کمسن اور جوان لڑکی سے، ایسے لوگوں کی خوبیاں نہیں تلاش کرنی پڑتیں۔ خود بخود سامنے آجاتی ہیں۔

مجھے یاد ہے دوسری سہاگ رات کا منظر بھی، وہ کمرے میں آئے۔ سرخ گھونگھٹ نکالا گیا تھا نہ اٹھایا گیا۔ مجھ سے کوئی بات کئے بغیر ہی انہوں نے کمرے کی لائٹ بجھا دی۔ طوفان جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے گزر گیا۔

اس رات کے باقی لمحات!

شوہر کے بے ہنگم خراٹوں کی آواز سنتے گزرے۔ اس رات مجھے پہلے خاوند کی بہت یاد آئی۔ ان کی شفقت ان کا بے لوث پیار یاد کرکے میں صبح ہونے تک سسکتی رہی۔

انہوں نے اپنی فیملی سے الگ مجھے ایک فلیٹ میں رکھا۔ گھر میں تمام سہولتیں میسر تھیں۔ کئی کئی ملازم، کار، ٹیلی فون، مجھے ایک بہترین عشرت کدہ تو مل گیا تھا مگر میرے خاوند ہفتہ میں صرف ایک روز میرے فلیٹ پر آیا کرتے تھے۔ وہ مستقل طور پر اپنی پہلی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سال بھر بعد ہی میں ایک پیاری سی بچی کی ماں بن گئی۔ اب میں رفتہ رفتہ اپنے پہلے شوہر کو بھولتی جا رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی ایک نیا آزار لگ گیا تھا۔ اب میرے اندر سوئی ہوئی عورت جاگ اٹھی تھی۔ ایک خواہش ایک تمنا احساس کی جڑوں میں آہستہ آہستہ پیوست ہو رہی تھی۔

میرا دل چاہتا کہ میں بھی دوسری عورتوں کی طرح شام ڈھلے اپنے شوہر کے ساتھ سمندر کے کنارے جاؤں۔ گیلی ریت پر بیٹھ کر پیار کی باتیں کریں۔ ایک ساتھ فلمیں دیکھیں، اور پھر ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے گھر لوٹ آئیں۔ مگر یہ صرف خواب تھا حقیقت میں تو میرے حصے میں صرف تنہائی تھی، گھٹن تھی۔ اب تو میرے شوہر زیادہ تر ٹیلی فون پر ہی مجھ سے باتیں کرتے گھر پر نہ آنے کے کئی کاروباری بہانے بنالیا کرتے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی سرد مہری کو سہہ لیا کرتی۔

کہتے ہیں موجیں کناروں کو خود ڈھونڈ لیا کرتی ہیں۔ ایک دن ایک مضبوط کنارا میری کشتی سے بھی آلگا۔ وہ میرا آئیڈیل تھا، بالکل میرے خوابوں کے شہزادے جیسا۔ میں

نے ابھی مسکرانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ میرے شوہر نے ایک دن مجھے چونک کر دیکھا۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ میرے خاوند کو جیسے ہی اس حقیقت کا احساس ہوا خاموشی سے میرے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما کر مجھے میکے بھیج دیا۔ دو ماہ بعد میری بچی بھی داغِ مفارقت دے گئی۔ تھوڑے دنوں بعد میری والدہ بھی دنیا سے سدھار گئیں۔ اب میں اکیلی تھی، ایک دم اکیلی۔

آسمان تلے پہلی بار خود کو آزاد اور خود مختار محسوس کر رہی تھی۔ سوچا زندگی بھر شادی نہ کروں گی۔ در در کی ٹھوکریں کھا کر وقت گزارتی رہی۔ لیکن یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ بغیر مرد کی عورت ہر کسی کو بے بیاس دکھائی دیتی ہے۔ میں سماج کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ ایک بار پھر اسی موڑ پر آن کھڑی ہوئی جہاں مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ شادی کر لوں۔ اپنے اس آئیڈیل سے جس کی وجہ سے طلاق ہوئی تھی شادی کے لیے جب بھی سوچتی ، اس کے اور میرے درمیان فاصلے کی ایک لمبی لکیر دکھائی دیتی۔

وہ خوبصورت اور جوان ضرور تھا مگر ابھی زیرِ تعلیم تھا۔ زندگی گزارنے کے لئے اس کے پاس صرف ایک کرائے کا مکان تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی جس کی کفالت وہ دو چار ٹیوشن سے کرتا تھا۔ اور میں آسائش زندگی کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ کسی اوسط درجے کے شخص کے ساتھ گزر کر ہی نہیں سکتی تھی اور پھر میں نے ——

تیسری بار

اپنی مرضی سے اپنا شریکِ سفر چنا۔

جو کہ میری والدہ کے گزشتہ انتخاب سے جدا نہ تھا۔ ہماری عمروں کے درمیان اب بھی وہی فاصلہ ہے جو پہلی شادی کے وقت تھا۔

میرے تیسرے خاوند مجھے بہت چاہتے ہیں بلکہ انہیں گلہ رہتا ہے کہ میں انہیں بھرپور پیار نہیں دیتی مگر میرے اندر کی عورت اب بھی اکثر مجھ سے پوچھتی ہے۔ ”کیا واقعی تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو؟“

اس وقت مسکراتے ہوئے میں اپنے پھول سے بیٹے کو گود میں اٹھاتی ہوں۔

شاہجہاں کی زندگی کا ہر باب کھلا پڑا تھا۔ میں نے اسے قریب سے پڑھا ہے۔ شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عورت قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے۔ مجاز نے عورت کے لئے ہی کہا تھا۔

تیرے ماتھے کا جھومر مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھالیتی تو اچھا تھا

لیکن آج عورت مرد کے ہاتھوں اپنی شناخت کھو چکی ہے۔ عورت کو بدکردار، بیوفا اور بدچلن کہنے سے پہلے اس کے اندر کی عورت کو بھی دیکھئے کہ وہ جذبات و احساسات کی زبان میں کیا کہتی ہے۔؟

کوٹھے سے خانقاہ تک

وہ ایک انتہائی تجرباتی سال تھا۔

کئی چہروں سے نقابیں اٹھیں، کئی رخ تاریکی سے روشنی میں آئے۔ کچھ گنوایا کچھ حاصل کیا۔ کبھی زخم ملے، کبھی مرہم لگا، کبھی سخت دھوپ اور تپش میں ٹھنڈک گھل گئی، کبھی موسمِ سرما میں شعلوں کی طرح جلی، برسات آئی تو دھرتی کی پیاس بڑھا گئی۔ اب کے سب کچھ عجیب عجیب لگا۔

اسی سال میری نانی انتقال فرما گئیں۔ پھر دوسرا جھٹکا لگا، میرے سسر سنجر عظیم آبادی دنیا میں نہیں رہے۔ وہ اپنے دور کے ایک مقبول شاعر ہی نہیں ایک عظیم شخصیت بھی تھے۔ جن سے مجھے شفقت، محبت اور حوصلہ ملتا تھا۔ ہماری ازدواجی زندگی کی گرتی دیوار کو سنبھالا دینے کی کوشش میں ان کا نمایاں رول ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے پاس بہترین مقام عطا فرمائے۔

ایسا لگتا تھا یہ سال ٹھہر گیا ہو۔ ہفتے اور مہینے، واقعات وحادثات کی شدت میں جم گئے ہوں۔ ہر روز ایک نیا منظر، ہر دن ایک نیا مشاہدہ۔ وہ ایمان افروز شام بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب میرے پیر و مرشد خانقاہ میں تشریف فرما تھے۔ آج محفلِ سماع منعقد تھی۔ قوال امیر خسروؒ کا فارسی کلام سنا رہے تھے۔ طبلے، ڈھول، اور ہارمونیم کی مسحور کن آواز فضا میں دور دور تک کیف وسرور کا ایک رنگ بھر رہی تھی۔ انہیں لمحات میں سامنے سڑک پر ایک

نوجوان ساز کی آواز سن کر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور اندازہ کر لیا کہ وہ جس مقام پر کھڑا تھا اس کے سامنے والی بلڈنگ کے کسی فلیٹ سے آواز آرہی تھی۔ اس نے سوچا یہ یقیناً کسی طوائف کا مجرہ ہے۔

اس کے ہاتھ میں شراب کی خالی بوتل تھی وہ پاس ہی کے علاقے فورس روڈ کے ایک کوٹھے سے کسی طوائف کے لیے شراب لینے نکلا تھا کہ ایک مقناطیسی کشش نے اس کے قدم روک دیئے۔ اور اب وہ غیر ارادی طور پر بلڈنگ کے زینے طے کرتا ہوا پہلی منزل پر آکر ٹھہر گیا۔ سامنے خانقاہ تھی۔ محفل سماع جاری تھی وہ خانقاہ کی کھڑکی کے پاس باہر گیلری میں کھڑا ہو گیا اور سامنے مسند پر بیٹھے ہوئے اس شخص کو غور سے دیکھنے لگا جس کی آنکھوں میں مقناطیسی چمک تھی۔ چہرے پر نُور اور شخصیت میں وقار تھا۔

یہاں کوئی طوائف یا رقاصہ نہ تھی ہاں، چند سفید ریش بزرگ البتہ عالم وجد میں ہاتھ اوپر اٹھا کر جھوم رہے تھے۔ حاضرین میں سے لوگ وقفے وقفے سے آکر مسند نشین کی قدم بوسی کرتے اور پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے، اس نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا، سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔

اے حسین بے نیاز تیری اک نگاہ نے
ایماں کو کفر ، کفر کو ایمان بنا دیا

قوال نے جب اس شعر کی گردان شروع کی تو اسے لگا کہ اس کے اندر لاتعداد بت ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے ہوں۔ وہ مبہوت سا کھڑکی پر کھڑا منظر میں کھویا ہوا تھا۔ جانے کب محفل ختم ہوئی، کسی نے اس کے قریب آکر اسے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔

"بیٹے اندر آجاؤ حضرت تمہیں بلا رہے ہیں۔"

وہ ڈرا سہما خوفزدہ سا لڑکھڑاتا ہوا خانقاہ کے ہال میں داخل ہوا اور سر جھکا کر سلام پیش کیا۔ منے میاں حضور نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"سیف اللہ" اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"طوائف کے کوٹھے پر۔"

"کیوں اور کب سے؟" حضرت نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"جب سے اپنے کارواں سے بچھڑا ہوں۔"

"ہاتھ میں کیا ہے؟" حضرت نے خالی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"میں شراب لینے جا رہا تھا۔ ڈھول باجے کی آواز سن کر اوپر آ گیا کہ شاید کوئی طوائف رقص کر رہی ہے۔"

حضرت نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر مراقبے میں رہے پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا سیف اللہ دوزانو بیٹھا سر جھکائے زارو قطار رو رہا تھا۔ ہر قطرہ جیسے فریاد بن کر کہہ رہا تھا۔

راستے شیخ و برہمن نے بتائے کیا کیا
یہ نہ پوچھا کہ مسافر تیری منزل کیا ہے

چند ہی لمحوں بعد مسافر اور منزل کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ سیف اللہ نے حضرت منے میاں کے ہاتھوں پر بیعت لے کر، اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ دیا۔

توبہ کے آنسوؤں نے باطن کی کثافت کو دھونا شروع کر دیا۔ ایک کامل جوہری کی خصوصی توجہ سے اس قیمتی پتھر کی تراش خراش شروع ہو گئی۔ اس رات کے بعد سیف اللہ نے کبھی کوٹھے کا رخ نہ کیا۔ مرشد کے حکم پر اپنے والدین سے معافی مانگی اور ان کی مرضی و پسند کے مطابق شادی کر لی۔ اپنے تمام فرائض کو انجام دیتے ہوئے اپنے پیر و مرشد سے محبت اور عقیدت کی مثال قائم کی۔

اس واقعہ کو برسوں گزر گئے ہیں۔ سیف اللہ آج کئی بچوں کا باپ ہے۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی بگڑا ہوا نوجوان ہے جو آدھی رات میں بالا خانے سے اتر کر شراب کی دکان ڈھونڈنے نکلا تھا۔ حلیہ ہی بدل گیا۔ لمبا کرتا، لنگی، سر پر سلسلے کی مخصوص ٹوپی، چہرے پر گھنی داڑھی، اور آنکھوں میں سرخ ڈورے، جنہیں دیکھ کر لگتا ہے اس خالی بوتل میں ساقی نے پورا مے کدہ انڈیل دیا ہو۔ مرشد کے نورانی باطن کا عکس

اس کے قلب کی کثافتوں کو اس طرح دھو رہا تھا کہ سیف اللہ اپنے نام کی تاثیر بن گیا۔ بہ زم گوشہ رکھنے والے پر اس کی شخصیت کا ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ اس شعر کی صداقت پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

رفعت کمالِ عشق کی بس پاسکا وہی
جو بھی نثارِ خاک درِ یار ہو گیا

اور میں اس کا شہر چھوڑ آئی

جس ماحول میں زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے اس کی کیفیت کا احاطہ لفظوں کی قید سے باہر ہے۔

گوتم بدھ نے کہا تھا کہ۔ دنیا دکھوں کا سمندر ہے۔

اور مجھے لگتا اس سمندر کا ہر دکھ صرف میرے لیے بنایا گیا ہو۔ میرے دل کی دھڑکنیں اب بھی اس شخص کے نام کی گردان کر رہی تھیں، یہ نام کیا تھا ایک اسم اعظم تھا جو میرے وجود میں ایک برقی لہر بھر دیتا تھا۔ ایک دن اپنی خاموش پرستش کو نام دینا چاہا تو کاغذ کی سطح پر قلم خود بخود پھسلتا چلا گیا۔ زندگی میں پہلی بار شعر کہا۔

شوقِ سجدہ ہے تو اک دن کیا سے کیا ہو جائے گا
اس کا گھر کعبہ میرا اور وہ خدا ہو جائے گا
درد کو رہنے دو دل میں اے میرے چارہ گرو
موت آئے گی تو دردِ دل فنا ہو جائے گا
مت مٹا تو نقشِ پا اپنے کہ دیوانہ ہے یہ
ڈھونڈ کر تیرا پتہ خود لا پتہ ہو جائے گا
ہم تو جاتے ہیں تمہارے اس جہاں کو چھوڑ کر
کیا کرو گے حشر میں جب سامنا ہو جائے گا
شمع کے آنسو نہ رکھ دیں راز ان کا کھول کر
مہرباں گر وہ ہوئے غم بے مزہ ہو جائے گا

یہ درد کا سیلاب ہر روز جی سے گزرتا رہا۔ کبھی اشعار کہتی، کبھی ڈائری لکھتی، میں لکھتی جاتی اور روتی رہتی۔

"تو میرا عظیم خیال ہے۔ تجھ سے حسین اور پیارا میری نگاہ میں کوئی نہیں۔ کیوں کہ میری سوچ، میری فکر، میری روح، میری ہستی، میرا سب کچھ تیرے نام پر تصدق ہو چکا ہے۔ تیرے رخ کا قرآن لیے تیری ذات کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہوں اور اب یہ حالت ہے کہ۔

آنکھ ہوتی ہے جو بیتاب تلاوت کے لیے
رحلِ دل پر تیرے جلووں کا صحیفہ دیکھوں
آئینہ بن کے جو ساری بشریت آئے
کوئی تصویر کوئی عکس نہ تجھ سا دیکھوں

تو میرے دکھوں کے گیت نہیں سن سکتا، میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تو میرے تمام دکھوں سے بے خبر رہے۔"

اب مجھے ایک ہی راہ دکھائی دیتی تھی وہ یہ کہ اس گھر، اس بستی، اس شہر سے اتنی دور چلی جاؤں جہاں مجھے کوئی جانتا نہ ہو اور نہ میں کسی کو جانوں۔ انہیں دنوں ایک عتاب اور مجھ پر نازل ہوا کہ جن تین لفظوں نے مجھے قید کیا تھا، انہیں تین لفظوں نے آج آزاد کر دیا۔ مجھے ایسا لگا اچانک ایک تپتے ہوئے ریگستان میں آگئی ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک جس شجر کی پناہ میں تھی وہ بے سایہ تھا۔ تنہا ازل سے تھی اس کے باوجود آج خود کو بہت تنہا محسوس کیا۔ قدرت کے فیصلہ پر سر خم کرنا ہی پڑتا ہے۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ تقدیر بدلی جا چکی تھی۔ لوحِ محفوظ کا لکھا اٹل ہے۔

یہ 1980 کا پُر آشوب زمانہ تھا جب میں نے بمبئی شہر کو الوداع کہا، اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس دیار کو خدا حافظ کہتے ہوئے جہاں میری زندگی کے اہم حصے گزرے تھے دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک گھر جو گھر نہ تھا پھر بھی اسے چھوڑتے ہوئے دل کٹ رہا تھا اور قسمت تسلی دے رہی تھی۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

اس سفر میں زادِ راہ کے نام پر لٹی ہوئی تمنائیں میرے ساتھ تھیں۔ زخمی زخمی روح لیے جب فرنٹیر میل سے دہلی کے اسٹیشن پر اتری تو لگا، ایک بہت بڑے صحرا میں بالکل تنہا کھڑی ہوں۔ اس لمحہ خواب کا ایک منظر سامنے آگیا۔ جس میں محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا۔ "اب تو تُو خوش ہے نا؟"

اس خواب کی تعبیر، اس بشارت کا مفہوم خود بخود سمجھ میں آتا چلا گیا۔ میں رو پڑی۔ "ہاں میں بہت خوش ہوں۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنے شہر میں پناہ دی۔"

والدہ کے یہاں قیام کیا۔ اجنبی ماحول، پست حوصلے، قدم قدم پر نروس ہو جایا کرتی۔ بچے میرے ساتھ تھے۔ ان کی کفالت کی فکر نے زندگی کو مسلسل جد و جہد میں مصروف کر دیا۔ میرا اپنا جو ذاتی سرمایہ تھا اس سے ایک سر چھپانے کی جگہ حاصل کی جو اوکھلا کے ایک مسلم علاقہ میں واقع ہے۔ ملازمت پسند نہ تھی لہٰذا مکان کی تعمیرات کو ذریعہ معاش بنایا۔ جو عورت بمبئی جیسے شہر میں رہ کر تنہا روڈ نہ پار سکتی ہو وہ اب کس حوصلہ سے Construction کا کام کر رہی تھی۔ دیکھنے والوں نے سراہا اور میں آج تک سمجھ نہ پائی کہ مجھ میں یہ ہمت کہاں سے آئی؟ اور کیوں کر آئی؟ یہ سچ ہے کہ وقت انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے، مگر مجھے باہمت بنانے میں جو پر خلوص ہستیاں شامل رہی ہیں ان میں محکمہ انٹیلی جینس کے اعلیٰ افسر مسٹر واسدیو اور ان کی مسز رتنا جو انتہائی خوبیوں کی مالک ہیں، قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی دنیا کو پرکھنے اور سمجھنے کا سلیقہ عطا کیا۔ میں ان کی ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔ آج واسدیو جی اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی ہمدردیں، خلوص اور ان کی عظمت ہمیشہ میرے دل میں زندہ رہے گی۔!

ایک پیکر خوشبو کا

طوفان جب آتا ہے تو بڑے سے بڑے درخت کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ میری بساط کیا، ایک خزاں رسیدہ پتہ ہی تو تھی، شاخ سے گری تو جانے کس کس زمین کا مقدر بنی۔

اب میں اس دوراہے پر تھی جہاں ایک طرف خوشیاں تھیں، زندگی تھی، اور دوسری طرف لامحدود غم، فیصلہ میرے ہاتھ میں تھا۔ خود مختار تھی۔ مگر غموں سے ایسی رغبت ہوئی کہ خوشیوں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ غموں کا ہی انتخاب کیا۔ غم ہی چنے۔ اپنی زندگی کے ورق ورق پر صرف غم ہی لکھے۔ زندگی کو زندگی کا حق نہ دے کر اسے صرف تھپکیاں ہی دیتی رہی۔

لاکھ دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اور اگر بھولے سے کبھی آئینۂ دل پر کوئی عکس ابھرا بھی تو تقدیر کے غبار نے اسے دھندلا دیا۔ انسان کچھ چاہتا ہے اللہ کی مرضی کچھ اور ہوتی ہے۔ خواہشوں اور تقدیر کے درمیان لمحوں کا لمس اپنی لذتیں لیے وجود میں زندہ رہتا ہے۔ میرے اندر بھی کئی ایسے لمحات زندہ ہیں جن کی مہک سے سرشار ہو اٹھتی ہوں۔

وہ ایک پھول تھا۔ ایک گلاب تھا۔ سرخ رنگ کا جس کی پنکھڑیوں پر شبنمی قطرے جھلملا رہے تھے، وہ میرے ہی لان میں کھلے گلابوں میں سے ایک گلاب تھا مگر سب سے جدا،

بالکل منفرد، جیسے شاخ سے ٹوٹتے ہی اس کی تاریخ بدل گئی ہو۔ کتنا معصوم، کتنا پاکیزہ، کتنا مقدس، بڑے احترام سے میری انگلیوں نے اسے تھاما تھا۔ اس لمحہ محسوس ہوا میرے ہاتھوں میں کئی لکیریں بنتی چلی گئیں۔ اور ان لکیروں میں دکھ بھری داستانیں جنم لیتی رہیں۔ اور ایک روز پھول مرجھا گیا کیوں کہ اس کی زندگی عارضی ہوتی ہے مگر خوشبو اب تک باقی ہے کیوں کہ وہ فنا نہیں ہوتی، منتقل ہوتی ہے۔ ہر خوشبو ایک پیکر چاہتی ہے چاہے سرخ ہو، زرد ہو، سفید ہو، اسے فرق نہیں پڑتا اسے تو مہکنے سے کام ہے۔

آٹھ سال کا عرصہ انگلیوں کے شمار پر گزر گیا۔ پھر یوں ہوا کہ سبھی پرائے ہو گئے۔ اندھیرے اجالوں کے اس کھیل میں جانے کیا کیا گم ہو گیا؟ کھونے اور پانے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ نشیمن پھر بنے، بجلیاں پھر گریں۔ وجود جتنا مٹایا گیا اتنا ہی اجاگر ہوا، زندگی میرا کے اس شعر میں حرف حرف ڈھل کے رہ گئی۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھیا راکھ
میں برہن ایسی جلی، کوئلہ بھئی نہ راکھ۔!!

دیکھا جو عکسِ یار......!

وہ رات بھی ایک رات تھی۔
جب آنکھیں بند تھیں اور منظر جاگ رہے تھے۔ شب کا آخری پہر تھا۔
ایک سانولی رنگت والے نے آکر پیغام دیا۔
"وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں"۔
میں نے پوچھا۔ "کون؟"
جواب میں جو نام بتایا گیا وہ صرف ایک نام نہ تھا بلکہ ایک کائنات تھی۔ اُس وقت میں نے اپنی داہنی انگلی میں چمکتی اس انگوٹھی کو غور سے دیکھا جس پر "م" کھدا ہوا تھا۔ محسوس ہوا دھیرے دھیرے یہ حرف دنیا کے تمام حروف پر محیط ہوتا جارہا ہے۔ پیغام دینے والا اجنبی شخص جاچکا تھا۔ کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔
سینے میں دھڑکن کی رفتار بڑھی ہوئی تھی۔ بستر سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ ایک گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ دروازہ کھولا اور صحن میں آگئی۔ گلاب کی کیاریوں کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھولوں کے قرب میں کانٹوں کا احساس من میں ایک چبھن پیدا کرنے لگا۔ پھر چھت پر ٹہلنا شروع کردیا۔ ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت مجھ پر گزر رہی تھی۔ بھرا ہوا گلاس بار بار خالی ہو رہا تھا۔ ہونٹ پھر بھی خشک تھے۔
9 تاریخ 1983 ستمبر کا یہ مہینہ ایک ستم گر کا روپ لیے ہوئے تھا۔ نیند غائب،

چین گم، ایک سفاک لمحہ کی قید میں، میں بے چین پرندہ کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔

رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ سحر قریب تھی۔ نرم گدّے والا بستر جیسے آگ برسا رہا تھا۔ کمرے کے فرش پر چٹائی بچھائی اور لیٹ گئی۔ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

سانولی رنگت والا شخص پھر سامنے تھا۔

"وہ آرہے ہیں۔" اس نے ایک سمت کو اشارہ کیا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ایک وسیع و عریض میدان میں کثیر تعداد میں لوگ جمع ہیں اور ہر کوئی ہاتھ اٹھا اٹھا کر بے حد ادب سے درود شریف پڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھ میری والدہ ہیں، میرے بھی ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ والدہ نے کہا۔

"جلدی جلدی درود پڑھو۔ تمہیں معلوم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لا رہے ہیں۔"

اور پھر چند لمحوں بعد میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک پیکر حسن، سفید لباس میں جلوہ گر تھا۔ جس کی شخصیت کا اجالا ہر سُو بکھرا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے چند صوفیوں کی قطار تھی۔ حضور ﷺ کے پیچھے پہلے نمبر پر ہمارے سلسلے کے ایک بزرگ صوفی جوہر دہلوی ہیں، اس کے بعد کئی لباس والے نا آشنا چہرے۔ ان کو دیکھا تو لگا، میری انگوٹھی سے حرف "م" نکل کر نورانی فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔

میں نے حضور ﷺ کو سلام پیش کیا۔

انہوں نے ہلکے سے سر کو جنبش دے کر اشارے سے جواب دیا اور مسکرائے۔

اُف! وہ عالم میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی یا گلاب کی پنکھڑیوں پر بہاروں کا وجدانی رقص۔

خاموش وہ رہے تو رسالت مآب ہے
جو بولنے لگے تو خدا کی کتاب ہے

ان کی آنکھیں تھیں یا نشے کا ایک گہرا سمندر جس میں ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ بھی

نہ ابھرنے کے لئے ڈوبے۔ ایسی آنکھیں جس کی تمنا لئے جانے کتنے ہی سرمدؒ و منصورؒ سر دار ہوئے۔ قدم مبارک جہاں جہاں پڑ رہے تھے لگتا تھا وہیں ایک ایک جنت تعمیر ہوتی جا رہی ہے۔ چہرہ ایسا منور جیسے قرآن کے سادہ اوراق پر آیات اتر رہی ہوں۔ کیسے بیان کروں اس منظر کو جو ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ قلم بے بس ہے، عقل قاصر ہے۔

روح تو ہر منظر کو دیکھ سکتی ہے۔ ہر کیفیت کو محسوس کر سکتی ہے اور اس کا اظہار کر سکتی ہے۔ لیکن جب نور کا مشاہدہ کرتی ہے تو ششدر اور حیران رہ جاتی ہے۔ نور کی بارشیں جن قلوب پر ہوتی ہیں اس کا حال تو اہل دل ہی جان سکتے ہیں لیکن اس کی پھوار اس قلب پر جو محسوس ہوئی اس کا اظہار بھی نگاہ کرم ہے۔

خواب ٹوٹ گیا۔!

آنکھ کھل گئی۔!

اور پھر ایسی بیدار ہوئی کہ کسی خواب کا کھٹکا، کسی تعبیر کا غم نہ رہا۔ انہیں لمحات میں یہ نعت پاک کہی۔

جن کو عشقِ رسول ہوتا ہے
ان کا سجدہ قبول ہوتا ہے
یادِ احمدؐ میں جو نہیں تڑپے
اس کا جینا فضول ہوتا ہے
زرد موسم میں گر وہ آجائیں
خار بھی کھل کے پھول ہوتا ہے
روشنی جسم و جاں میں پھیلی ہے
دل پہ کس کا نزول ہوتا ہے
شمع ان کے سفر کا کیا کہنا
چاند قدموں کی دھول ہوتا ہے۔!!

تصویر میری اس طرح بے رنگ ہی رہی

قریب تھا کہ دماغی توازن کھو بیٹھتی مگر انہیں دنوں حسرتوں کے قافلے میں گزرتا ہوا ایک حسین لمحہ دل کے ویران جزیرے پر آکر ٹھہر گیا۔ وہ لمحہ کیا تھا بلکہ ایک صدی تھی، ایک عہد تھا ایک جہان تھا۔

حکم جاری تھا۔

شع کھل جائے گی سجدوں کی حقیقت تجھ پر
درِ جاناں پہ جبیں اپنی جھکائے رکھنا

عقیدتیں نثار تھیں!

وہ لمحہ لمحہ عبادت شمار کرتی ہوں
کہ جن میں ذکر ہو ان کا اور آنکھ بھر آئے

آنکھوں میں نمی بن کر اترنے والا کبھی سامنے نہیں آیا، جو ہجر دیتا ہے وہ صرف خواب دکھاتا ہے اور ہم تعبیروں کے فریب میں کھوئے رہتے ہیں۔

ستمبر 1985 میں میرا پہلا ناول "سماج" منظر عام پر آیا اور 1986 میں یوپی اردو اکادمی نے اس پر مجھے ایوارڈ دیا تو ایسا لگا، اس ناول کے تمام کردار میرے سامنے کھڑے مجھ سے پوچھ رہے ہوں۔

"زخموں کی نقاب کشائی پر تمہیں انعام تو مل گیا لیکن کوئی مرہم بھی ملا؟" جواب

میں ہمیشہ کی طرح میرے اندر کوئی بولتا رہا۔

مٹی کا جسم لے کے چلے ہو تو سوچ لو
اک روز راستے میں سمندر بھی آئے گا
دنیا کے اس سلوک کا غم شمع کس لیے
جب آئینہ بنی ہو تو پتھر بھی آئے گا

اب میری شعری تخلیقات بھی ملک کے بیشتر رسائل میں کثرت سے شائع ہونے لگی تھیں۔ اب میں کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کر لیا کرتی، مگر چند ہی مشاعروں کے بعد یہ سلسلہ ترک کر دینا پڑا۔ کبھی مشاعرے ہماری تہذیب و تمدن کے آئینہ دار کہلاتے تھے مگر اب محض تفریحی بن کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال خواتین کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ شمع محفل بن کر ہی ادب کی خدمت کریں، گھر کی چہار دیواری میں بھی رہ کر یہ خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مشاعروں کی زیادہ تر شاعرات کے پیچھے کسی استاد کی کاریگری ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار خلیل انجم صاحب نے مجھ سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال کیا تھا۔

"آج جب بھی کسی نئی شاعرہ یا ادیبہ کا نام سننے یا پڑھنے میں آتا ہے فوراً دماغ میں غالبؔ کا یہ مصرعہ۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں، آجاتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

دراصل عورت کو ناقص العقل سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہنے والے بزعم خود بقراط مردوں کی وجہ سے ورنہ ضروری نہیں کہ ہر ذہین عورت کی صلاحیت کو مشکوک سمجھا جائے۔ حالانکہ اردو میں رشیدہ جہاں، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، اور بشریٰ رحمٰن تک بے شمار خواتین ثابت کر چکی ہیں کہ وہ "جینوئن (Genvine) فنکار ہیں۔

لوگ اکثر پوچھتے ہیں، ہر فنکار کی مقبولیت کے پیچھے کسی بڑے فنکار کا ہاتھ تصور کیا جاتا ہے، آپ کے پیچھے کس بڑے فن کار کا ہاتھ ہے؟

جی ہاں، میری مقبولیت کے پس پردہ کسی ایک فن کار کا ہاتھ نہیں، بلکہ درجنوں

فنکاروں کا ہاتھ ہے۔ ان فنکاروں میں کلاسک ادب کے تمام نمائندہ اساتذہ، افسانہ نگاروں کے علاوہ موجودہ دور کے مشاہیر اہل قلم بھی شامل ہیں، کیوں کہ میں مطالعہ کو ہی ذہن کی غذا تصور کرتی ہوں اور نہ ہی میں اپنی کسی بھی شعری یا نثری تخلیق کی تکمیل کے بعد کسی ماہر فن سے اصلاح لینے کا اہتمام کرتی ہوں لیکن مشورہ یا پسند کو برا بھی نہیں سمجھتی۔

میری تخلیقات کے مداحوں میں پڑھے لکھے قارئین کے علاوہ میرے گھر کی ملازمہ تک شامل ہے۔ مجھے لوگوں کی ایماندارانہ تنقید سے ہمیشہ روشنی ملی ہے اور میں اپنے قارئین کی پر خلوص آراء کو ہی سب سے بڑا Compliment سمجھتی ہوں۔

زندگی جیسے سوالوں کے دائرہ میں اسیر ہو۔

ہر کوئی پوچھتا ہے۔ میں سفید لباس ہی کیوں پہنتی ہوں؟

اب انہیں کیا بتاؤں کہ کاتبِ تقدیر نے روزِ ازل سے ہی میری زندگی کا ہر خانہ Blank رکھا ہے۔ جب مصور خود گریزاں ہو تو تصویر کیا کرے؟ کہاں سے رنگ لاؤں؟

پھولوں سے بے انتہا رغبت ہے شاید اس لیے کہ ان کی زندگی بھی بالکل میری داستاں جیسی ہے۔ چند روز شاخوں پر رہ کر بکھر جانے کن کن قدموں کی دھول بنتے ہیں۔

ہر طرح کی خوشبو بھی بے حد عزیز ہے۔ یہ نظر نہیں آتی مگر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ہم اسے چھو نہیں سکتے مگر یہ ہمیشہ ہمیں اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ مجھے آئینہ بھی بہت اچھا لگتا ہے وہ بالکل اپنا سا لگتا ہے۔ سچائی کی شبنم میں دھلی ہوئی اس کی ہستی پر جب نظر پڑتی ہے تو سوچتی ہوں، ہم انسانوں سے بہتر تو یہ بے جان آئینہ ہے جو ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ شاید اسی لیے روزمرہ کے معمولات میں سے ایک معمول میرا یہ بھی ہے کہ صبح میں سب سے پہلے اٹھ کر وضو کرتی ہوں، مصلے پر جانے سے پہلے آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہوں۔ اداسی، ویرانی، خاموشی یہ حصارِ کرب دھیرے دھیرے آئینے میں ایک سجدہ گاہ بنتا جاتا ہے۔ اس وقت دفعتاً کہیں بالکل قریب سے آواز آتی ہے۔

لغزشوں میں ادا ہوئے سجدے
ہم طریقِ نماز کیا جانیں..!

کس قیامت کے یہ نامے......!

میرے مداحوں میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کے غیر مہذب خطوط سے تنگ آکر 1986 میں خاتونِ مشرق میں قارئین کے نام ایک خط چھپوانا پڑا جو اس طرح تھا۔

جناب فاروقی صاحب!

یہ خط میں آپ کو قارئین کی بصیرت کے لیے لکھ رہی ہوں۔ سچ پوچھیے تو اس مکتوب کے اصل مخاطب وہ حضرات ہیں جنہیں خواتین کی تخلیقات پڑھ کر عشقیہ خط لکھنے کا مرض ہے۔

جہاں تک میں سمجھتی ہوں عام حالات میں ہر ادیب یا شاعر کو اس مدیر کا شکر گزار ہونا چاہیے جو اسے عوام سے روشناس کراتے ہیں۔ لیکن ہماری زبان کے بیشتر (سب نہیں) قارئین کا یہ حال ہے کہ وہ اردو کے رسائل اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ خواتین افسانہ نگاروں اور شاعرات کو محبت نامے لکھنے کے لئے خریدتے ہیں۔ میری بات میں کتنی سچائی ہے اس کا تجربہ ہر اس خاتون ادیبہ کو ہوگا جس کی تخلیقات اکثر و بیشتر اردو جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ دراصل میری تخلیقات کی اشاعت کے بعد ہر مرتبہ کثیر تعداد میں خطوط آتے ہیں مگر اب یہ سلسلہ میرے لیے سوہانِ روح بن گیا ہے۔

میرا خیال ہے آج کا مرد طبقہ اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ادب یا زندگی کے دوسرے شعبہ میں عورت کو اپنے ہم قدم دیکھ سکے۔ خیر، ان خطوط میں اگر تعریفی نہ

سہی تنقیدی خطوط بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے ادیب کو اپنی اصلاح کا موقع ملتا ہے لیکن ستم بالائے ستم کہ سو میں سے نوے خطوط اردو قاری کی سفلہ ذہنیت کا المیہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں غیر پختہ ذہن کی پیداوار ایک صاحب اتنے حسین خط لکھتے ہیں کہ اگر یہی خطوط ان کی ہمشیرہ یا والدہ کے نام پوسٹ کر دیے جائیں تو یقیناً وہ صاحب خودکشی کر لیں۔

یورپ کے مداح حضرات کو ایسی تصاویر بھیجنے کا شوق ہے جو اگر ان کے گھر کی خواتین کو بہ طور تحفہ روانہ کر دی جائیں تو تمام زندگی سر نہ اٹھا سکیں۔

بہر حال! میں آپ کے رسالے کے توسط سے قارئین اور خطوط لکھنے کے شوقین حضرات سے استدعا کرتی ہوں کہ خدارا مجھے خط نہ لکھیں، اپنے خطوط کے جوابات کی بھی امید نہ رکھیں اور مستقبل میں لکھے جانے والے ہر خط کا میں پیشگی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ہاں اگر خط لکھنا ہی ہے تو میری ذات کے بارے میں نہیں میرے فن، میری کاوش کے بارے میں لکھیں، نوازش ہوگی۔

اس خط کی اشاعت کے بعد میری پُرزور مخالفت کی گئی۔ جن لوگوں کو میری تحریر کے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آیا، انہوں نے مجھے گالیوں اور دھمکیوں بھرے خطوط لکھے۔ برا بھلا کہا، کافی عرصہ تک "خاتون مشرق" میں ان کے زہر آلود خطوط شائع ہوتے رہے۔ گھٹیا گھٹیا القابوں سے مجھے نوازا گیا۔ کسی نے میرے سادات ہونے پر شک کیا، کسی نے تصویر کا پوسٹ مارٹم کیا۔ کسی نے ننگے سر رسائل میں تصویر چھپوانے پر طنز کیا، میرے گناہ و ثواب کے حاجب ایک طویل عرصہ تک کڑاہی کے تیل کی طرح کھولتے رہے اور دھواں دھواں ہوتے رہے۔ جن کا ضمیر مطمئن نہ ہو وہ ہمیشہ بے چین اور خوف زدہ رہتے ہیں۔

مگر کچھ ایسے مداح بھی تھے اور ہیں جن کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے مجھے فخر اور خوشی کا احساس ہوتا ہے جن کے خطوط ایک مضبوط سہارے کے مانند پاکیزہ اور پر خلوص جذبوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ کتنا عظیم شخص تھا۔ جس نے اپنے خط میں لکھا، "خط کا جواب ملے یا نہ ملے، میرے لیے دونوں جذبہ احترام کے قابل ہے۔"

اور وہ غم شناس تھا جس نے لکھا کہ۔

"آپ کے اشعار کے مفہوم کو جو سمجھ جائے وہ آپ کی قوتِ برداشت کو ناپ سکتا ہے۔"

اور وہ یقیناً مسیح صفت تھا جس نے لکھا کہ

"آپ کے قلم میں آپ کے خواب ٹوٹنے کی جھلک ہے۔"

اور وہ جس کا نام صادق ہے، صادق زیبی پڑوسی ملک کا باشندہ، اپنے نام کی طرح سچا، کھرا اور مخلص جس نے مجھے 20 سال پہلے بہن کہا تھا اور آج تک اس مقدس رشتے کو نبھا رہا ہے۔ ایک بار صادق نے اپنے خط میں بے حد جذباتی ہو کر لکھا تھا۔

"شمع! ہم کاش ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنے ہوتے۔"

یہ جملہ واقعی منزہ دل کی خوب صورت علامت ہے۔ تحریر شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔

کچھ لوگ، کچھ لمحے، کچھ یادیں دل کے نہاں خانوں میں قید ہو جاتی ہیں۔

برسوں گزر چکے ہیں مگر یادداشت کے اس زنداں میں ایک چہرا اکثر ابھرتا ہے، سید نوازش مجذوبی، ایک ادیب، ایک صحافی، ایک شاعر، ایک دوست، آزاد کشمیر پاکستان کا ایک انوکھا کردار، جو اپنی منزہ تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ بھی شاید اسی دشت کا سیاح تھا جس سے میں گزر رہی تھی۔ جانے کتنے کٹھن مراحل طے کر کے اس نے یہ عبارت لکھی ہو گی۔

"تمام کائنات، عرش و فرش، کرسی لوح و قلم پاتال و تحت الثریٰ پہ نظر دوڑا کر آپ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہوں کیوں؟؟؟

شمع صاحبہ! میرے خطوط کا جواب دیں یا میرے لوحِ وجدان سے اپنا خیال کھرچ ڈالیں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ میں کون سے اُلہامی لفظ لکھوں کہ آپ میری عقیدت کو سمجھ پائیں۔ میں آپ کو صدائیں دے دے کر گلا زخمی کر چکا ہوں۔ ہر بار آواز لوٹ کر یہ مژدہ سناتی ہے کہ۔

"یہاں رہتا نہیں کوئی۔"

گزشتہ ماہ پہلی بار ہندوستان آیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک پروفیسر دوست کے یہاں قیام کیا۔ جہاں سے آپ کا گھر بہت قریب تھا۔ چاہتا تو آپ سے ملاقات کی درخواست کر سکتا تھا۔ مگر بے حد خوددار ہوں کاسۂ طلب خالی ہی لے کر لوٹ آیا۔

اور وہ شہر دیکھا جس کے بارے میں سنا تھا کہ یہ سات بار اجڑا اور سات بار آباد ہوا اور جس کا بادشاہ اکبر، جہانگیر کو مانگنے پیدل آگرہ گیا۔ اور جہاں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور دیگر مشہور ہستیاں اسی دہلی میں پیوند زمین ہیں جہاں بختیار کاکیؒ، باقی باللہؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، امیر خسروؒ محو استراحت ہیں۔ جہاں دریائے جمنا کسی فلسفی کی طرح خاموش بہتا جارہا ہے۔ جس کے شمالی حصے میں آگرہ ہے جہاں شاہجہاں کی حسرتوں کا تاج محل کب سے نیر بہا رہا ہے۔ اس دہلی میں کیا کیا نہیں، قطب مینار، لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ، جامع مسجد، موتی مسجد اور اسی دہلی کے ایک گوشے میں آباد ہے "ذاکر نگر" جہاں آپ کا سکون کدہ ہے جسے میں گوشۂ خاموشی کہتا ہوں۔

کچھ آپ کی چپ، کچھ ماحول چپ، کچھ اوپر والا چپ، کچھ الفاظ گونگے اور کچھ پڑھنے والے لکنت زدہ، اور لکھنے والا آشفتہ سر ایسے گڈمڈ ماحول میں کتنی خوشبو ہے آواز کے نہ ہونے کی۔

شمع جی! گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں۔ آپ کے جواب سے میری روح مطمئن ہو سکتی ہے۔ دلجوئی کرنا حج اکبر ہے۔ جواب دیں خدا کے لئے، اس کی وحدت و عظمت و رفعت و عزت کے لیے، اس کے مقدس پاکیزہ و طاہر و معطر بندوں کے لئے، اس کے نبی کے جاں نثاروں کے لئے، حسنِ یوسفؑ کے لئے، عشقِ زلیخا کے لئے، گریۂ یعقوبؑ کے لئے دمِ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے، بازوئے حیدرؓ کے لئے، عصمتِ زہرہؓ کے لئے، چادرِ زینبؓ کے لئے، شہیدانِ کربلاؑ کے لئے، توریت و انجیل و زبور کے لیے، تسبیح و درود کے لیے، کعبہ کے لیے، خدائے جمیل و شکیل کے لیے، اس بندۂ فقیر و ذلیل کے لیے، سب کو چھوڑ دیں تو صرف اور صرف حضرت محمد ﷺ کے لیے، اپنے ہونے کی شمع جی، کچھ تو سند دیں۔"

اس کے بعد میں نے ایک تفصیلی خط نوازش مجذوبی کو لکھا تھا۔ جس کے جواب میں یہ چند سطور ملی تھیں۔

"شمع جی! مجھے آپ کا خط ان لمحات میں ملا، جب میں بیٹھا ہوا اپنے غموں کا حساب لگا رہا تھا دکھوں سے نڈھال تھا، کیوں کہ چند ہی روز قبل عمو جان زمین کی چادر اوڑھ گئے۔

اس کے بعد مجھے "ہندکو" زبان کی ریسرچ میں انٹرنیشنل اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجیز ایران کی جانب سے جو اعزازی ڈگری ملی تھی وہ انہوں نے واپس لے لی۔ جس کے لیے میں نے اپنے کئی قیمتی سال ضائع کیے تھے۔ ان کا صلہ یہ ملا کہ "ہندکو" زبان کوئی زبان نہیں ہے۔

اب حضور چراغ سحری ہیں جانے کب !

کون سا لمحہ کس حادثے کی نذر ہو جائے، ہر وقت سہما رہتا ہوں۔ شاید اسی لیے آپ کا لفافہ چاک کرنے میں مجھے کئی گھنٹے لگ گئے۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ آپ کے خط سے خوابوں کی کرچیاں نکل نکل کر احساس کو لہو لہو کر گئیں۔ میں نے آپ کو اپنے افکار کا پیکر سمجھا تھا مگر کیا علم تھا کہ سارا شہر کانچ کا بنا ہوا ہے جو ہلکی سی آہٹ پر یوں بکھر جائے گا۔

میری لرزتی انگلیوں میں آپ کا خط ہے اور میں دیکھ رہا ہوں درختوں کی شاخیں جو کبھی گل و ثمر سے لدی تھیں۔ اب لمحہ لمحہ کاسۂ غریب کی صورت، خالی ہو رہی ہیں۔ چنار کے پتے جو مسلسل بارش سے سرخ ہو گئے ہیں بے سہارا تاج محل کی طرح گر کر خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہے ہیں، اور یوں لگ رہا ہے جیسے صدیوں کی تھکاوٹ، وحشت، اداسی سٹ کر میرے بوسیدہ گھر کی اینٹ اینٹ میں بس گئی ہے۔

اور ایسے میں، میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ شہر، یہ بستی، یہ ملک چھوڑ کر اس ماحول سے بہت دور چلا جاؤں۔ شام کے سناٹے دھیرے دھیرے اتر رہے ہیں رات اپنا آنچل پھیلا رہی ہے۔ بارش کی چھم چھم اب بھی جاری ہے اور میں نے رختِ سفر باندھ لیا ہے۔ کل 25 دسمبر 1985 صبح کی فلائٹ سے یہ آشفتہ سر ایران چلا

جائے گا، ہمیشہ کیلئے۔

آپ کا
نوازش مجذوبی

اس کے بعد یہ متلاطم سمندر پر سکون ہو گیا۔ پھر کبھی نوازش کا کوئی خط نہیں آیا۔ پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر شہید ہونے کی آرزو شاید ختم ہو گئی تھی۔

جب کبھی خطوط کی فائل میری نظروں سے گزرتی ہے تو نوازش مجذوبی کی تحریریں بے تعلق رہ کر بھی روح کے کسی گوشے میں ایک ایسا رشتہ قائم کر لیتی ہیں جو ہم میں مشترک ہے۔ جسے ہم دکھ کہتے ہیں ۔ !!

آنچل میں دودھ اور آنکھوں میں پانی

یہ شاید 1986 کی بات ہے۔ رامپور سے شائع ہونے والے ایک رسالہ "ماہ رخ" کے ایڈیٹر نے "عروس نمبر" کے لئے مجھ سے چند خواتین کے انٹرویو مانگے تھے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جن جن خواتین سے ملی، ان کا ذکر اپنی خودنوشت میں بھی شامل کر رہی ہوں۔

شادی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ شادی دو جسموں اور روحوں کا ملاپ ہی نہیں ایک خوش گوار کیفیت کا نام بھی ہے، مگر دیکھا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر یہی لفظ انسانی زندگی میں ایسا زہر گھول دیتا ہے کہ وہ اس مقدس رشتے کو غلط ڈھنگ سے سوچنے لگتا ہے۔ ہماری وہ بہنیں جن کی شادیوں کو کئی سال گزر چکے ہیں، اکثر یہ شکایت کرتی ہیں کہ ان کے شوہر اب ان میں پہلی سی دلچسپی نہیں رکھتے۔ غیر عورتوں کی تعریف اور ادھر ادھر منہ مارنے میں ہی اپنی شان سمجھتے ہیں۔ آخر کیوں؟ وہ بہنیں جو اپنے شوہروں کے بستر پر جگہ تو پالیتی ہیں مگر دلوں میں نہیں، ایسی کئی خواتین کی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے میں تقریباً ایک ہفتہ تک مختلف لوگوں سے ملتی رہی اور انہوں نے مجھ سے جو کچھ کہا وہ بغیر کسی تبدیلی یا آمیزش کے آپ کے سامنے پیش ہے۔

نایاب جو میری خالہ زاد بہن ہے۔ 14 سال کی یہ کمسن کلی سرخ جوڑے میں لپٹی گٹھری بنی ہوئی تھی کمرے میں اس وقت میرے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ نایاب کا گھونگھٹ اٹھا کر آہستہ سے پوچھا۔

”تمہاری بارات آنے میں صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟“

آنسو بھری آنکھیں اٹھیں اور جھک گئیں۔ وہ بولی۔

”مجھے پتہ نہیں بجیا۔ بس میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر لڑکی پر یہ لمحات گزرتے ہیں۔ یہ بتاؤ جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے تم نے کبھی اس کو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ نظریں نیچی کر کے بولی جیسے کہہ رہی ہو، اچھے ہی ہوں گے۔

اور میں اس معصوم لڑکی کو دیکھتی رہی جسے اتنا بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ چند گھڑیوں بعد جس کو اپنی پوری زندگی سونپنے جا رہی ہے وہ کیسا ہے؟

بارات آئی نکاح ہوا اور وہ پرائی ہو گئی، رخصتی سے چند منٹ پہلے میں نے نایاب سے پوچھا تھا۔ ”اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے اس وقت تمہیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟“

”یہی کہ کاش! میں لڑکی نہ ہوتی لڑکا ہوتی تاکہ اپنے ابو امی اور چھوٹے بھائی بہنوں سے مجھے کوئی جدا نہ کرتا۔“

وہ اپنا جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی پھوٹ کر رو پڑی۔ اپنے آنسوؤں کو سنبھالنا اب میرے لیے بھی بہت مشکل ہو رہا تھا۔

اور آج جب نایاب سسرال سے واپس آئی تھی، دوڑ کر میرے گلے لگ گئی، اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے، اداسی کی جگہ چہرے پر ان گنت رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں نئے خواب کی سرشاری سے خمار آلود تھیں۔ وہ بالکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی جیسے اس کی الہڑ دوشیزگی ایک ہی چھلانگ میں سنجیدگی کی دہلیز پر آ پہنچی ہو۔ طلوع ہوتے سورج کی سنہری شعاعوں کی طرح وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

”تمہارے میاں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا، پہلی بار تم سے مخاطب ہوئے تو کیا کہا اور وہ جملہ تمہیں کیسا لگا؟“

"انہوں نے میرا گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔ آج سے تم میری ہو۔ یہ ان کی پہلی آواز تھی جو میرے کانوں کو بہت اچھی لگی اور محسوس ہوا واقعی اب تک بے شمار اپنوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے پن کا کوئی گوشہ خالی تھا۔"

نایاب کی یہ باتیں سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ میں جانتی ہوں، انسان کتنا ہی ناسمجھ اور بدھو ہو، تجربہ انسان کے لئے سب سے بڑا استاد ہے۔

کئی دنوں سے یہ خبر میرے محلے میں بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی کہ ہمارے پڑوسی وکیل صاحب کے بیٹے نے کسی طوائف زادی سے شادی کر لی ہے۔ لہٰذا اگلے دن بن بلائے مہمان کی طرح میں وکیل صاحب کے گھر جا دھمکی۔ اتفاق سے گھر میں نئی نویلی دلہن اور ملازمہ کے سوا دوسرے افراد موجود نہ تھے۔

وہ طوائف زادی جس کا نام افروز تھا۔ ادب سے جھک کر مجھے سلام کیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سرخ غرارہ، جمپر، سر پر لمبا آنچل نظریں حیا سے جھکی ہوئی۔ "پون پل" کے گناہوں کا یہ ثمر مجھے کسی دیوی کا روپ لگ رہا تھا۔

پھر میں نے اپنا انٹرویو شروع کیا۔

"سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گی کہ یہ شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی ہے یا کسی خوف یا دباؤ کے تحت؟"

افروز مسکرائی اور بولی۔ "میں جس ماحول سے نکل کر آئی ہوں وہاں عورت آزاد اور خود مختار ہوتی ہے۔"

"آپ مجرا کرتی تھیں، غالباً آپ کا طرح طرح کے مردوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ کیا کبھی ان میں سے آپ کا کسی کے ساتھ کوئی جذباتی رشتہ بھی قائم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں"

"جب آپ کی شادی ہوئی۔ شادی کی وہ پہلی رات جو عورت کی زندگی کی سب سے یادگار رات ہوتی ہے اس رات کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟" "شمع صاحب! میں انتہائی صاف گو ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ اس رات سے پہلے بھی مجھ

پر کئی ایسی راتیں گزری ہیں لیکن اس رات جب میرے شوہر نے مجھے چھوا تو ایسا لگا، زندگی میں بالکل پہلی بار کسی مرد نے مجھے ہاتھ لگایا ہو۔ میں اس سرشاری کی کیفیت کو کوئی لفظ نہیں دے سکتی۔ صرف محسوس کر سکتی ہوں۔"

افروز کا شکریہ ادا کر کے جب میں نے اسے خدا حافظ کہا تو اس وقت اس کا خاوند گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے قدرے جھک کر سلام کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا، اور میں اس جواں ہمت مرد کی عظمت کو سراہے بغیر نہ رہ سکی جس نے کیچڑ میں کھلے ایک پھول کو اپنے گھر کی زینت بنا لیا تھا۔

رشیدہ خان بھی ہمارے محلے کی ہی ایک لڑکی تھی جس نے مجھے بتایا۔

"شمع صاحبہ! مجھے ایک ایسے شخص سے پیار ہو گیا تھا جو ہمارے خاندان سے الگ ہی نہیں، لوگوں کی نظر میں انتہائی بُرا انسان تھا۔ چرس گانجے کی اسمگلنگ اور شراب کے کئی اڈے چلاتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی بار مختلف جرم میں سزا بھی کاٹ چکا تھا۔ شہر کے نامور بدمعاشوں میں اس کا نام سرفہرست تھا جب میرے گھر والوں کو اس محبت کا علم ہوا تو مجھ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں اب مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ جب عشق کے طوفان کو روکا جائے تو وہ سارے بند توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ بے پناہ سختیوں کے باوجود ہم ملاقات کی سبیل نکال ہی لیا کرتے تھے۔ میں اب محمود کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

مگر ہمیں اپنی ناکامی کا احساس اس دن ہوا جب میرے پاپا نے میرے ماموں زاد بھائی سے میری شادی طے کر کے شادی کے کارڈ لوگوں میں تقسیم کرا دیے۔ میں اپنے ماموں زاد بھائی کی کرتوت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ انتہائی لالچی اور موقع شناس لڑکا تھا۔ اس کے باوجود میں انکار نہ کر سکی۔ پاپا کی عزت کو سرخ لباس سے ڈھک دیا۔

آج میری سہاگ رات تھی۔

یعنی خاندانی فرائض کے سامنے اپنے جذبوں کی قتل گاہ پر شہید ہونے کی رات۔

رات کے نہ جانے کس پہر میں وہ کمرے میں داخل ہوئے روتے روتے میری

آنکھ لگ گئی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا، میں سہم گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور پھر انہوں نے میرے کان میں آہستہ آہستہ جو کچھ کہا، میرے سارے وجود میں لرزہ طاری ہو گیا۔

میں گھبرا کر بستر سے اٹھ بیٹھی اور کہا کمرے کی لائٹ آن کیجئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔

''روشنی کرنا اس وقت خطرے سے خالی نہیں تم اپنے ہوش وحواس درست کرو اور میری بات دھیان سے سنو! تمہارے شوہر نے مجھ سے اپنی سہاگ رات کا سودا کر لیا ہے۔ صرف دس ہزار روپے کے عوض میں، اور وہ اس وقت باہر دروازہ پر کھڑا پہرا دے رہا ہے۔ اس کی شرط یہ تھی کہ میں تمہیں پہلے بے ہوش کروں تاکہ یہ راز کبھی تم پر ظاہر نہ ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں مل سکتا تھا مگر میں نے تم سے محبت کی ہے اپنی سطح سے کبھی نہیں گر سکتا۔ وقت کم ہے آؤ ہم پچھلے دروازہ سے بھاگ چلیں۔ تم میری امانت ہو تمہاری عزت کی حفاظت میرا فرض ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے محمود کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور کمرے کے اس دروازہ سے باہر نکل آئی جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔

رشیدہ خاموش ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''اس کے بعد آپ کے شوہر اور والدین نے کوئی قانونی کاروائی نہیں کی؟''

''کی تھی مگر مقدمہ ہار گئے مجھے طلاق ہو گئی اور اب میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ میری زندگی میں ہر طرف خوشیاں ہیں، نغمے ہیں، سکون ہے، میرے خاوند نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ میں اپنے ماضی کو یکسر بھول گئی ہوں۔''

اس مادی دور میں جہاں لوگوں کے ظاہر اور باطن میں زمین اور آسمان کی تفریق نظر آتی ہے رشیدہ خان کی صاف گوئی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آج بھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو سچائی کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ جو لوگ محمود جیسے لوگوں کو سماج کے ماتھے کا ایک بدنما داغ سمجھتے ہیں کیا انہوں نے کبھی مولانا آزاد کے اس قول پر

غور کیا ہے......؟

”اگر کسی کی آنکھوں کو روشنی سے ضعف آتا ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنی آنکھوں کا علاج کرائے، اس کے لیے چراغوں کو گل نہیں کیا جا سکتا۔“

اس کے بعد میں نے جن محترمہ کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی وہ میری بے حد قریبی دوست ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں۔ ان کا نام بتانے کی اجازت نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کے لئے موضوعِ بحث بننا نہیں چاہتیں۔ تو آیئے ہم انہیں ش صاحبہ کے نام سے مخاطب کیے لیتے ہیں۔ میں نے محترمہ سے پوچھا۔

”آپ خوبصورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خاندانی ہوتے ہوئے بھی اب تک تنہا کیوں ہیں؟ میرا مطلب ہے شادی کیوں نہیں کی؟“

”شمع شادی سے پہلے ہر لڑکی کا ایک خواب ہوتا ہے لیکن میرا خواب ایک الگ ہی نوعیت کا ہے جو شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔“

وہ تھوڑے توقف کے بعد بولیں۔

دراصل میرا آئیڈیل ایسا مرد ہے جو مجھے بھرپور پیار تو دے مگر میرا غلام بن کر نہ رہے۔ میرے حسن کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہ ملائے میں روٹھ جاؤں تو مجھے منانے کے لئے میرے پاؤں پر اپنا سر رکھ کر مردانہ وجاہت کو پامال نہ کرے۔ غم و مصیبت میں عورتوں کی طرح آنسو نہ بہائے۔ اپنے سارے کام دھندے چھوڑ کر میرا منہ نہ تکتا رہے۔ ہر وقت میری ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے میری معمولی سے معمولی غلطی پر مجھے ڈانٹے۔ مجھ سے روٹھے، مجھ پر اپنا رعب رکھے۔ سچ تو یہ ہے کہ عورتوں کے پیچھے ہر دم کتوں کی طرح دم ہلاتے ہوئے مرد مجھے قطعی پسند نہیں۔

میں نے دوسرا سوال کیا۔

”آپ کی زندگی میں کبھی ایسا موڑ بھی آیا جب آپ نے کسی ایک شخص کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہو؟“

”جی ہاں! ایک بار نہیں یہ موڑ بارہا آیا لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ کوئی مرد بھی

میرے تخیلاتی معیار کو نہیں چھو سکا اور اپنی خواہشوں کے خلاف شادی کرنے سے تو بہتر ہے کہ زندگی بھر کنواری رہوں۔"

"ش صاحب! آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ عورت کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب اسے مرد کے سہارے کی تخت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بڑھی ہوئی عمر کے باعث وہ سہارے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے پہلے کبھی ہاتھ بڑھائے تھے۔"

وہ بڑے عزم سے بولیں۔ "جانتی ہوں، مگر میں اتنی کمزور عورت بھی نہیں کہ وقت آنے پر اپنا بوجھ خود نہ اٹھا سکوں.....!"

"خدا آپ کے حوصلوں کو آسمان کی بلندی عطا کرے۔" میں نے ش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور تلاش کے اگلے موڑ پر رک گئی۔

میں ان مسکراہٹوں کا بے حد احترام کرتی ہوں جن کے پس پردہ لاکھوں حسرتیں گھائل زدہ پرندوں کی طرح تڑپ رہی ہوں۔ جب میں جامعہ نگر کی نکہت صبا سے ملی تو محسوس ہوا ان کی نظریں کہہ رہی ہوں۔

چھپا ہوا ہے زمانے کا کرب چہرے پر
مجھے قریب سے جس نے پڑھا اداس ہوا

"نکہت! میں زیادہ کرید کر آپ کے احساس کو شدید نہیں کرنا چاہتی۔ صرف اتنا بتا دیجئے کہ طلاق کے بعد آپ دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیوں کر چکی ہیں؟ جب کہ دنیا میں ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا؟"

"لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے۔ میں شادی تو کر لوں لیکن میرے دل و روح پر میرا پہلا شوہر قابض رہے اور جسم اس مرد کے قبضے میں جسے میں ہمیشہ غیر سمجھتی رہوں میرے نزدیک یہ فعل سراسر گناہ ہے "

میں نے پوچھا۔ "آپ کی اتنی وفا شعاری کے باوجود آپ کے شوہر نے آپ کو طلاق کیوں دی؟"

"طلاق انہوں نے نہیں دی بلکہ میں نے خود لی۔ کیوں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور

کئی بچوں کے باپ تھے۔ یہ بات مجھ سے چھپا کر شادی کی تھی۔ جس کا انکشاف مجھ پر چھ ماہ بعد ہوا تھا۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے پیار کی تقسیم نہیں۔ میں نے فوراً طلاق لے لی۔ مرد کسی ایک کا ہو کر رہے تبھی اچھا لگتا ہے"

"آپ کو یہ کب اور کس طرح پتہ چلا کہ آپ کے شوہر پہلے سے شادی شدہ ہیں؟"

"میرے میاں نے مجھے خود بتایا۔ اس وقت جب ہماری شادی کو چھ ماہ بیت چکے تھے۔ وہ چاہتے تو اس راز کو مجھ سے برسوں چھپا سکتے تھے مگر ان کے اس انکشاف کے پیچھے شاید یہی مقصد چھپا ہوا تھا کہ میں اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤں اور طیش میں آ کر ان سے طلاق لے لوں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ بعد میں اس حقیقت کا بھی علم ہوا کہ موصوف پہلے بھی اس طرح کی کئی خفیہ شادیاں کر چکے تھے، اور پھر اپنی بیویوں کے جہیز میں لائے سامان، زیورات اور روپوں سے موج اڑا کر بیویوں کو اپنے ماضی کے بارے میں بتا دیا کرتے تھے....."

"آفرین ہے آپ پر نکہت کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ غم کی اس جان لیوا کیفیت کا مرتکب کون ہے آپ نے اس شخص کو میاں جیسے لفظ سے یاد کیا، اور اب تک اپنے دل میں اس کے لئے ایک مخصوص گوشہ رکھتی ہیں۔"

میں نکہت سے مل کر اپنے گھر پہنچی تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں طبیعتاً بہت حساس ہوں۔ کسی کا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ ایک سریڈون کی گولی کھائی اور بستر پر جا گری۔ سامنے ہی ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ جانے کب اور کیسے میرے اندر سے ایک عورت نکل کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"اے شمع بی! کبھی تم نے خود سے بھی پوچھا ہے کہ تم عورت ہونے کی سزا کب سے بھگت رہی ہو؟"

کچھ میکدہ فروش نہ آزردہ ہوں کہیں
اے ہم نشیں نہ چھیڑ میری تشنگی کی بات

میں نے یہ شعر پڑھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی !!

قصوروار کون؟

کبھی کبھی ایک چھوٹا سا جملہ پوری کہانی بن جاتا ہے اور اس کہانی کا کبھی اختتام نہیں ہوتا۔ ایسی ہی ایک کہانی کا ذکر ہے۔

یہ بمبئی باندرہ ایسٹ بہرام نگر کی گندی بستی میں رہنے والی ایک عورت کی کہانی ہے، جس کا نام ثروت بیگم ہے، سانولی رنگت، گٹھیلا جسم، چہرہ پر کشش نمک دار، ہنس مکھ اور ملنسار، ان پڑھ مگر گفتگو میں ایک مہذب انداز۔

ان سے میری شناسائی تقریباً بیس سال پہلے ہوئی جب وہ ہمارے ہی پڑوس کی ایک بلڈنگ کے شاندار فلیٹ میں رہتی تھیں۔ بمبئی میں اسٹیل کی الماریوں کے ان کے کئی کارخانے تھے۔ دولت، عزت، آسودگی، ان کے ماحول میں بھرپور زندگی تھی۔ کبھی کبھی میں اس پر رشک کیا کرتی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ پھولوں پر چلنے والے قدم اندر سے کتنے زخمی ہیں۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑی ہیں میں انہیں خالہ کہتی ہوں۔ ان کا احترام کرتی ہوں مگر گفتگو کے دوران ہم صرف دوست ہوتے ہیں۔ وہ بے حد مخلص اور غمگسار بھی ہیں۔ دوسروں کے لیے بے پناہ ہمدردی کا جذبہ رکھتی ہیں ان کے چہرے پر اکثر دکھ کی ایک گہری لکیر ابھرتے دیکھ کر ایک روز میں نے پوچھ ہی لیا۔

"خالہ ایسا لگتا ہے آپ اندر ہی اندر کوئی درد سہتی رہتی ہیں۔؟"

جواب میں وہ تھوڑی دیر خاموش رہیں۔ پھر بولیں تو ایسا لگا جیسے سمندر تمام

کنارے توڑ کر پورے شہر میں پھیل گیا ہو۔ آنکھوں کا سیلاب روکے نہ رکتا تھا۔

وہ کہہ رہی تھیں!

میں سن رہی تھی!

جیسے کائنات کے سینے پر ایک تاریخ درج ہو رہی ہو!

"بیٹی یہ اب سے تیس سال پرانی بات ہے۔ میں یوپی کے ایک خوبصورت اور تاریخی شہر کے متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ میرے والد کا شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا ہمارا خاندان بہت قدامت پسند تھا۔ گھر کے بزرگوں میں پچھلے زمانے کی تہذیب کا بھرپور عکس موجود تھا۔ سخت پردہ اور گھونگھٹ خاندانی روایات میں شامل تھا۔ لڑکیوں، عورتوں کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہ تھی "یہ نفسیاتی پہلو ہے کہ چھوٹے بچوں سے اگر کہا جائے کہ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو تو وہ وہی کرنا چاہتے ہیں جو کام ان کے لئے ممنوع کیا گیا ہو، اسی طرح چودہ پندرہ سال کی عمر بھی بے حد تجسس والی عمر ہوتی ہے۔ جذبوں کو جتنا دبایا جائے اتنا ہی ابھرتے ہیں۔ جس گھر میں جتنا زیادہ پردہ کا اہتمام ہوتا ہے ان کے گھروں کے جھروکوں سے اکثر لڑکیاں باہر گلی یا سڑک پر جھانکتی نظر آتی ہیں۔

یہ تجسس ہی تھا جو ثروت بیگم کو اس روز اپنے گھر کے احاطے میں لے گیا جہاں کچی مٹی کی دیوار پر چڑھ کر وہ منظر دیکھا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا بینڈ باجے کے ساتھ دو تین سَو لوگوں کا ہجوم تھا۔ سب سے آگے ہاتھی پر سوار ایک نوجوان جس کے گلے میں پھولوں کے موٹے موٹے ہار جھول رہے تھے۔ دراز قد، کسرتی جسم والا وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ ثروت بیگم نے پاس کھڑی اپنی ایک سہیلی رضیہ سے پوچھا۔

"یہ کون ہے جس کو اتنی دھوم دھام سے لے جایا جا رہا ہے؟"

"یہ ہمارے علاقے کا ایک پہلوان ہے جو کشتی میں بڑے بڑے انعامات حاصل کر چکا ہے۔ اس کی فتح پر اس کے جاں نثاروں نے یہ جلوس نکالا ہے۔"

رضیہ نے پہلوان رحمت کا تعارف دیتے ہوئے چونک کر کہا۔

"ثروت اب تم دیوار سے نیچے اتر آؤ۔ جلوس قریب آگیا ہے کہیں رحمت تمہیں

دیکھ نہ لے۔"

"دیکھ لے گا تو کیا ہوا؟" ثروت نے بھولپن سے کہا۔

اور اب رضیہ ثروت کو بتا رہی تھی کہ رحمت کتنا ظالم انسان ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس لڑکی پر دل آجائے وہ اسے قیمتاً یا جبراً حاصل کر لیا کرتا تھا۔

"اچھا؟"

ثروت بیگم نے آنکھیں گھما کر کہا۔

"ذرا میں بھی تو دیکھوں وہ کون ظالم ہے۔" ہاتھی قریب آچکا تھا۔ ثروت نڈر ہو کر دیوار سے لگی ہوئی امرود کے درخت کی ایک مضبوط شاخ کو پکڑ کر بلندی پر چڑھ گئی تاکہ وہاں سے اس بے درد انسان کو ٹھیک طرح سے دیکھ سکے۔ جب ہاتھی امرود کے درخت کے پاس سے گذرنے لگا تو جانے کیسے رحمت کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ سامنے ثروت بیگم کا چہرہ تھا۔ اس سے پہلے کہ رحمت کچھ اور سوچتا ثروت بیگم نے رحمت کے منہ پر نفرت سے تھوک دیا۔ سہیلیاں لرز گئیں۔ کچھ تو گھبرا کر ادھر ادھر بھاگ گئیں۔ مگر ثروت بیگم اب تک اس شخص کو نفرت سے گھور رہی تھیں جو عورت کی عصمت کا لٹیرا تھا۔

رحمت نے اس وقت تو خاموشی سے جیب سے رومال نکالا اور چہرے پر پڑا تھوک صاف کر لیا۔ مگر اگلے روز رحمت کے دربار میں اس تھوکنے والی کی فائل کھل گئی۔ نام پتہ، شجرہ، گھر میں کتنے افراد رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رحمت کی زندگی کا یہ سب سے بڑا حادثہ سب سے بڑی بے عزتی تھی اس کے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ ایک معمولی سی لڑکی نے اس کے منہ پر تھوک کر اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کی مردانگی کو چھیڑا تھا۔ اب وہ ہر وقت اس لڑکی سے انتقام لینے کے بارے میں طرح طرح کے منصوبے بنانے لگا۔

دوسری جانب ثروت بیگم اس واقعہ کو اس طرح بھول گئی جیسے برسوں پرانی بات ہو۔ سہیلیاں اکثر اسے ڈرایا کرتیں۔ مگر وہ بے خوف ہو کر جواب دیتی۔

"میرا کیا بگاڑ لے گا کمبخت مجھے ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔ ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ وہ بھی یاد

رکھے گا۔" ہاں، مگر جب یہ خیال آتا کہ کہیں وہ گھر والوں سے شکایت نہ کردے تو سہم جایا کرتی۔ ویسے بھی وہ اس گھر کی بہو تھی دو سال پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ پہلا بچہ تقریبا ڈیڑھ سال کا گود میں تھا اور خاوند پردیس میں۔ گھر میں بوڑھی ساس اور سسر تھے۔ تھوڑے فاصلے پر میکہ تھا۔

ثروت بیگم انتہائی سادہ لوح، بھولی اور الہڑ لڑکی تھی۔ کہنے کو وہ شادی شدہ تھی مگر جوانی کے تقاضوں سے بالکل لاعلم، شوہر جب جب پاس آتا اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، غصہ سے چہرہ سرخ ہو جاتا، اور ہر صبح ساس سے شکایت کرتی کہ ان کو سمجھایئے مجھے چھیڑتے ہیں، اور روزانہ میرے بستر پر، کبھی کپڑوں پر   کبھی پیٹ پر   آگے کا جملہ وہ پی جاتی۔ شرم سے آنکھیں بند کر لیتی اور سوچتی میرا چھوٹا بھائی جب رات کو بستر پر پیشاب کرتا تھا تو صبح اس کی خوب پٹائی ہوتی تھی۔

خاوند کے ساتھ ایک پلنگ پر سونا اس کے لیے سب سے زیادہ ناگوار بات تھی۔ جب تک شوہر جاگتا رہتا وہ سونے کی ایکٹنگ کر کے لیٹی رہتی اور دعائیں مانگتی کہ یا اللہ اس قصائی کو جلدی سے سلادے۔ مگر قصائی کب سوتا ہے جب تک گوشت کی بوٹی بوٹی نہ کرلے۔

جس دن سے خاوند پردیس گیا تھا ثروت بیگم نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ مرضی سے اٹھتی تھی مرضی سے سوتی تھی، جس کروٹ چاہتی لیٹتی، بستر صاف اور سلوٹیں درست رہتی تھیں۔ اب فجر کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی۔ کتنی راحت تھی اسے ان دنوں ..

مگر ایک دن اس راحت کدے میں آگ لگ گئی!

برسات کی وہ ایک بھیگی ہوئی شام تھی۔ ساس سسر پڑوس میں کسی کی تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گھر کی ملازمہ نماز میں مصروف تھی، اور ثروت بیگم اپنے کمرے میں تنہا کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی موسلا دھار بارش کا نظارا کر رہی تھی۔ ہوائیں تیز تھیں۔ کبھی کبھی بجلی کی گرج فضا میں گونجتی تو وہ سہم کر اپنی آنکھیں موند لیتی۔ اس بار بہت تیز آواز میں بجلی کوندی تو اس نے کافی دیر تک آنکھیں بند رکھیں۔ بجلی کا شور تھما تو اس نے آنکھیں

کھولیں۔ مگر اب کے جو بجلی کوندی وہ ثروت بیگم کے وجود پر گری تھی۔ سامنے رحمت کھڑا تھا۔ ثروت بیگم نے چیخنا چاہا، شور مچانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اگلے ہی پل رحمت کے فولادی ہاتھ اس کے منہ پر ٹیپ کی طرح چپک گئے۔ وہ بے بسی کے عالم میں رحمت کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو، مجھ پر رحم کرو، مجھے برباد نہ کرنا، میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ اس کی خاموشی فریاد کرتی رہی، اور زندگی لحہ بہ لحہ بربادی کے قریب ہوتی گئی۔

مرد پر جب جنسی بھوک سوار ہو تو وہ گونگا اور بہرہ بھی ہو جاتا ہے۔ اس نے ثروت بیگم کی ایک نہ سنی۔ سات پردوں میں رہنے والی ثروت اب صرف فطری لباس میں رہ گئی تھی۔ وہ رحمت کی بانہوں میں مچل رہی تھی، تڑپ رہی تھی کچھ بس نہ چلا تو رحمت کے داہنے بازو میں اتنی زور سے دانت کاٹ لیا کہ وہ ٹیس سے دوہرا ہو گیا مگر شکار پر گرفت مضبوط رکھی۔ کشتی کے میدان میں بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑ چکا تھا لوگ اس کی طاقت کا لوہا مانتے تھے۔ اپنے شہر میں اپنی مثال آپ تھا۔ ایسے فولادی شخص سے وہ کب تک مزاحمت کرتی، آخر ہار گئی، ہمیشہ طاقت ور کمزور پر حاوی ہوتا رہا ہے۔

"سنو! رحمت عورتوں کی محبت اور ان کا جسم حاصل کرتا ہے، ان کی نفرت نہیں، تم نے مجھ پر تھوکا اب زمانہ تم پر تھوکے گا۔"

یہ کہہ کر رحمت نے انتقام کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ آسمان پر بادل زور سے گرجا، اور ایک دھماکے کے ساتھ کوئی بجلی ٹوٹ کر کائنات کے سینے میں کہیں پیوست ہو گئی۔

ثروت بیگم نے نیم بے ہوشی کے عالم میں آنکھیں کھولیں تو دیکھا رحمت اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"اب تو کسی مرد پر نہیں تھوکو گی نا؟"

مگر فتح کے نشے میں چور رحمت اس وقت بری طرح چونک پڑا جب ثروت بیگم نے بستر سے اٹھ کر رحمت کے ہاتھ کے اس زخم کو چوم لیا جو اس کے دانتوں سے لگے تھے۔ !

اپنے بھرپور ہونے کا احساس لیے وہ دوسرے ہی پل کمرے کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ ثروت بیگم نے اپنے آپ کو درست کیا۔ کمرے کی ٹوٹی اور بکھری ہوئی چیزوں کو اپنی

اپنی جگہ پر رکھا۔ گھر کے تمام کمروں، دالان اور باورچی خانے میں جا کر چیک کیا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ اس حادثے کی وہ واحد گواہ ہے تو اطمینان کا سانس لیا اور سوچنے لگی یہ کیسا لٹیرا تھا کہ ایک عورت کا تمام سرمایہ بھی لے گیا اور اپنے لیے نفرت کی بجائے ایک کسک چھوڑ گیا ۔ ایک ایسی کسک جو جاتے ہوئے لٹیرے سے کہہ رہی تھی۔ پھر کب آؤ گے مجھے تباہ کرنے؟

تین مہینے کے اندر ہی ثروت بیگم کے دوسری بار ماں بننے کی خبر پورے خاندان میں پھیل گئی۔ پھر کیا تھا۔ ایک ہنگامہ برپا، ہر طرف رسوائی بدنامی لوگوں کے طعنے، نصیحتیں، فضیحتیں، مار پیٹ، لوہے کی گرم سلاخوں سے ثروت بیگم کو داغا گیا، مگر وہ بھی اپنی ضد کی پکی تھیں، لب نہ کھولے، مجرم کا نام نہیں بتایا، جیسے وہ بھی اس جرم کی نصف حصہ دار ہوں۔ یہ ساری تھو تھو اس لیے ہوئی کہ خاوند پردیس میں تھا۔ راز کھل گیا ورنہ ہمارے معاشرے کا یہ کھیل پرانا ہے۔ یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ دورِ حاضر میں پچیس فی صد اولادیں اپنے اصلی باپ کے نام سے لاعلم ہوتی ہیں۔

ہاں تو ثروت بیگم کے خاوند کو تار بھیج کر بلوالیا گیا۔ فیصلے کی گھڑی آئی تو بدکرداری کا سرٹیفیکیٹ طلاق نامہ کی شکل میں مل گیا۔ بچہ باپ کو دے دیا گیا۔

رحمت کو ان تمام باتوں کا علم تھا اور وہ دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا تھا۔ ثروت بیگم کے والدین نے اسے قبول نہیں کیا اور گھر سے نکال دیا۔ اس کی ایک سہیلی رضیہ نے جو بمبئی فلم انڈسٹری کے ایک مشہور شاعر کی بیوی تھیں اسے پناہ دی۔ جیسے تیسے دن گزرنے لگے۔ ثروت بیگم کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھیں۔ سلائی کڑھائی کر کے اپنی کفالت کا بار خود سنبھال لیا۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جب ان کے گناہ کا ثمر ان کی گود میں آگیا۔ بچہ نہایت خوبصورت گول مٹول، چوڑی چوڑی کلائیاں ہو بہو باپ جیسا۔ لگتا تھا کسی نے کاربن رکھ کر رحمت کی تصویر اتار لی ہو۔

رحمت نے جس دن سے سنا تھا کہ بچہ بالکل اس پر گیا ہے نہ جانے کیوں بار بار ایک خواہش دل میں پیدا ہو رہی تھی اسے ایک نظر دیکھنے کی، اسے قریب سے چھونے کی، اس کی رگوں پر ہاتھ پھیر کر اپنا خون ٹٹولنے کی۔ یہ کیفیت اس پر زندگی میں پہلی بار گزر رہی تھی۔ عورتوں کے جسم کے نشیب و فراز میں سیاحی کرتے ایک زمانہ گزرا تھا مگر اس طرح سے جذباتی لمحات کبھی نہیں آئے تھے۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ رات گئی، بات گئی۔۔۔ مگر یہاں تو بات رات سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اور دھیرے دھیرے کوئی چٹکیوں سے اس کا دل مسل رہا تھا۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اتنے ظلم و ستم کے باوجود ثروت بیگم نے اس کا نام نہیں لیا۔ وہ سماج میں داغدار ہو گئی۔ بے گھر ہو گئی۔ لاوارث اور بے سہارا ہو گئی۔ صرف اس لئے کہ اس نے ایک مرد کے منہ پر تھوکا تھا؟ اتنے سے جرم کی اتنی بڑی سزا۔ اب اس کا ضمیر مسلسل اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ وہ مضطرب ہو اٹھا۔ کشتی کے میدان سے لے کر عورتوں کے بستر تک اس کی تمام طاقتیں، قوتیں، اب اس کا منہ چڑا رہی تھیں، اور کہہ رہی تھیں رحمت! مردانگی کا نام طاقت نہیں، پہلوانی کا نام بہادری نہیں، مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کا دل جیت لے۔ بہادر وہ ہے جو دوسروں کے غم اپنے سینے میں چھپائے۔ میدان میں بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑ دینا فخر کی بات نہیں۔ بات تو جب ہے کہ کسی مجبور اور بے سہارا کے لیے یہ فولادی ہاتھ سہارا بنیں۔

اس کے قدم خود بخود رضیہ کے گھر کی جانب بڑھتے چلے گئے جہاں اس کے ہاتھوں لٹی ہوئی ایک عورت اس کی امانت سنبھالے امید کی آخری شمع جلائے بیٹھی تھی۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی رحمت نے کرایہ کا مکان لیا اور ثروت بیگم و ننھے بچہ کے ساتھ رہنے لگا۔ یوں تو رحمت کی شادی بہت کم سنی میں ہو گئی تھی۔ بیوی اب بھی موجود تھی۔ ان حالات میں عام طور سے بیویاں جو ماحول پیدا کرتی ہیں وہی ہوا۔ مگر رحمت نے تمام ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر ثروت بیگم کو اپنایا تھا اسے زمانے کی پروا نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کے نزدیک بیوی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ کیوں کہ وہ ایسا شجر تھی جس پر کبھی کوئی پھل پھول لگنے کی امید نہیں تھی۔ اس کی نظر میں وہ ایک ادھوری عورت تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں ثروت بیگم نے رحمت کے دل میں وہ مقام بنالیا جہاں بڑے بڑے سورما بھی عورت کے قدموں میں جھکے ہوتے ہیں۔ مگر اتنی محبت اور قربت کے باوجود رحمت نے اب تک ثروت بیگم سے نکاح نہیں کیا تھا۔اس بات کو لے کر اکثر ان میں نوک جھونک ہوجایا کرتی۔ رحمت میاں کہتے۔

"تم نہیں جانتیں اگر میں نے تم سے نکاح کرلیا اور یہ راز میری بیوی پر ظاہر ہو گیا تو جائیداد کے نام پر آج میرے پاس جو کچھ ہے اس سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ سب کچھ میری بیوی کے نام ہے۔ طلاق کی صورت میں وہ مجھے بے دخل کر دے گی۔ اور ہم ان شاندار مکانوں سے نکل کر فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔ میں اسی انجام سے ڈرتا ہوں۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہاری بیوی کے علم میں یہ بات ہوتے ہوئے کہ تمہارا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے اب تک بے دخل کیوں نہیں کیا ؟"

"ثروت وہ عورت تم سے مختلف ہے۔اس کا فلسفہ نرالا ہے۔ کہتی ہے کہ میں کسی بھی عورت کو استعمال کروں۔ جب تک چاہوں اس کے ساتھ رہوں مگر یہ کہانی باہر ہی ختم کردوں۔ ازدواجی سلطنت پر صرف وہی حکمراں ہو۔ مسز رحمت اللہ کہلوانے کا حق وہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔"

ثروت بیگم کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"مگر یہ بھی تو ٹھیک نہیں کہ ہم ہر دن ایک نئے گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں۔ رحمت ایسے ماحول میں تو میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

وہ التجائی نظروں سے رحمت کو دیکھتی، جو کسی چٹان کی طرح اٹل تھا۔ رحمت کی نظر میں مکان، جائیداد، جھوٹی شان و شوکت، اور جذبوں کی سوداگر ایک بیوی ہی سب کچھ تھی۔ گھٹن روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ اب اس کا رحمت پر سے اعتماد اٹھتا جارہا تھا۔ اگر واقعی اسے چاہتا ہے تو اپنی زندگی میں شریک کیوں نہیں کرتا۔ کیا وہ اسے صرف ایک داشتہ سمجھتا ہے؟ کیا وہ صرف اپنے بچے کی محبت میں اس سے وابستہ ہو گیا ہے؟

ہزاروں سوال تھے جو اسے ہر پل بے چین رکھتے تھے۔ ثروت بیگم نے مجبور ہو کر

ایک روز اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''میں اپنی سہیلی رضیہ کے ساتھ بمبئی جارہی ہوں۔ وہیں محنت مزدوری کر کے اپنے بچے کی پرورش کرلوں گی۔''

یہ سن کر رحمت تڑپ اٹھا، اور اس روز پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

''ایسا نہ کرنا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

مگر ایک روز ثروت بیگم چپکے سے بچہ لے کر رضیہ کے ساتھ بمبئی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد رحمت یقیناً بہت رویا، بہت تڑپا ہوگا۔

ادھر ثروت بیگم کو صبر آگیا تھا۔ سوچتی تھی اگر واقعی رحمت کو مجھ سے محبت ہوتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر میرے ساتھ آجاتا۔ محبت تو وہ شئے ہے جو تخت و تاج بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر رحمت سے تو ایک بیوی بھی نہ چھوڑی گئی۔

ثروت بیگم کو بمبئی میں رہتے ہوئے چھ سات ماہ گزر گئے تھے، رحمت میاں کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ نہ ثروت نے کوئی رابطہ کیا، اور نہ ہی رحمت نے پلٹ کر حال پوچھا۔ بغیر بندھن کا رشتہ دھیرے دھیرے کمزور پڑتا چلا گیا۔

اس روز محمد علی روڈ سے گزرتے ہوئے ایک دکان پر اچانک ہی ثروت بیگم کا سامنا ان کے سابق شوہر عباس سے ہوگیا جو اپنے بیٹے کی انگلی تھامے دکان سے نکل رہے تھے۔ اسے لگا اس کا دل پھٹ کر حلق میں آگیا ہو۔

اس کا بیٹا سیماب کتنا بڑا ہوگیا تھا جب وہ اس سے جدا ہوا تھا تب دو سال کا تھا۔ صرف چار سالوں میں اس کا باپ بھی کتنا بدل گیا ہے۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا نظر آرہا تھا۔ چہرے پر عینک کا اضافہ ہوگیا تھا۔

اس نے فوراً ٹیکسی لی اور گھر آگئی۔ بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، رضیہ اور ان کے میاں دیر تک اسے تسلی دیتے رہے۔

ہفتہ بھر میں ثروت بیگم کی ایسی حالت ہوگئی جیسے برسوں کی مریض، اس کی نظر میں ہر وقت سیماب گھومتا رہتا اور وہ مسلسل روتی رہتی۔ ایک روز رضیہ نے ثروت کو اس

بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک بار اپنے بیٹے سیماب سے مل لے۔ اس سلسلے میں وہ عباس سے گفتگو کرے گی۔

بہر حال! ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور عباس اپنے بیٹے سیماب کو لے کر رضیہ کے گھر پر آئے۔ ثروت بیگم نے سیماب کو سینے سے لگا کر ایسا بھینچا کہ گرفت ذرا بھی ڈھیلی رہی تو وہ پھر اس سے جدا ہو جائے گا۔

"میرا بچہ، میرا بیٹا، میرا امنا، میرا راجہ،" وہ بے تحاشہ اسے چومتی رہی۔ یہ منظر دیکھ کر کمرے میں بیٹھے ہوئے سبھی رو پڑے تھوڑی دیر بعد ہی عباس چلے گئے اور ثروت بیگم اس شخص کو دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی جو بے وفا نہیں مظلوم تھا!

اس کے بعد بھی سیماب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رضیہ جب بھی عباس کو فون کرتی وہ اپنے بیٹے سیماب کو لے کر آجاتے۔

عباس نے اب تک شادی نہیں کی تھی، اور نہ ہی کوئی ارادہ تھا۔ رضیہ نے ایک روز ہمت کر کے دبی دبی زبان سے عباس کے سامنے اپنی رائے اور خواہش پیش کر دی۔

عباس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے......؟"

"بھائی صاحب! یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

اور پھر ایک روز تقدیر کا لکھا زمین پر اتر آیا۔ ثروت بیگم مع اپنے دونوں بچوں کے عباس کی زندگی میں واپس آ گئیں عباس نے رحمت کی امانت کو بھی قبول کر لیا تھا یہ کہہ کر کہ آج سے یہ تمہارا ہی نہیں میرا بھی بیٹا ہے۔ ہاں مگر اس سے یہ راز ہمیشہ پوشیدہ رکھنا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔

ثروت بیگم دوبارہ ہنسنا مسکرانا سیکھ گئی تھیں۔ شوہر پر جب سے یہ حقیقتِ حال کھلی تھی کہ اس حادثے میں ثروت بیگم بے قصور تھی۔ ان کی عزت و محبت مزید بڑھ گئی تھی۔ ہاں رحمت کے لیے البتہ ان کے دل میں شدید نفرت تھی !

شوہر کا بمبئی میں اچھا کاروبار تھا۔ ہر طرح کی آسودگی تھی۔ زندگی آرام سے گزر

رہی تھی۔ مگر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ثروت بیگم اپنی زندگی میں کبھی کبھی ایک خلاء محسوس کرتی تھی۔ خاص طور سے اس وقت جب میاں سے قربت ہوتی۔ جی چاہتا وہ انہیں اپنے سے دور دھکیل دیں کیوں کہ تصور میں اس وقت رحمت اپنا تمام ترباںکپن لے کر سامنے ہوتا۔ وہ بے وفا تھا لیکن دل سے دور نہیں ہوا تھا۔ یہ وفادار شوہر تھا مگر اس کی رسائی صرف ثروت کے جسم تک تھی، عباس جب بھی اس کے دل کے آس پاس سے گزرنا چاہتے رحمت انہیں روک دیتا۔

بیوی کی خاموشی اور مردہ جذبات سے عباس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو ان میں سے تھے جنہیں صرف آم کھانے سے مطلب ہوتا ہے۔ گٹھلیوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ کبھی کبھی تو وہ نیند میں بے خبر ہوتی اور مسافر اپنی منزل طے کر جاتا۔ ان حالات میں ثروت بیگم رحمت کو شدت سے یاد کرتیں جو اپنے ہر انداز سے اسے دیوانہ بنادیا کرتا تھا۔ رحمت وہ مرد تھا جس کے چھو لینے سے رگوں میں خون کی روانی تیز ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن جب رحمت اور عباس کے کردار کا موازنہ کرتی تو عباس کا قد رحمت سے کہیں زیادہ نظر آتا ـــ !

عباس رحمت کی طرح مصلحت پسند، سفاک اور بزدل نہیں تھے۔ انہوں نے جس جرأت سے دوبارہ اسے اپنایا تھا اس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ رحمت نے اسے پیار کی ایسی لذتوں سے ہمکنار کیا تھا کہ وہ اسے بھول کر بھی بھلا نہ پاتی تھی وہ سوچتی ساری خوبیاں کسی ایک انسان میں تو نہیں سما سکتیں۔ کیا ہوا اگر عباس رحمت جیسے نہیں تجربے کے ترازو میں دو مردانہ توں تولے جاتے رہے کبھی رحمت کا پلہ بھاری ہوتا تو کبھی عباس کا .... !

آج ثروت بیگم نے اپنی دیوار سے پچیسواں کلینڈر اتارا تو احساس ہوا کہ وقت کتنی تیزی سے گزر گیا تھا۔ وقت اپنے ساتھ کچھ لے نہیں جاتا۔ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے ایک سرمایہ یادوں کا، زخموں کا، خوابوں کا، ہر شئے اپنی اپنی جگہ تھمی ہوئی تھی ٹھہری ہوئی تھی اور اس منظر میں رحمت دیوالی کے چراغ کی طرح روشن تھا۔ ثروت بیگم کے سیاہ بالوں میں اب سفید لکیریں شامل ہو گئی تھیں۔ بمبئی آنے کے بعد ان پچیس سالوں میں وہ کبھی اپنے وطن

نہیں گئی۔ اس حادثے میں دل ایسا ٹوٹا کہ تمام عزیز و اقارب سے رشتہ ہی توڑ لیا۔ مگر آج جب بھانجی کی شادی کا دعوتی کارڈ آیا تو پرانے زخم ہرے ہو گئے۔ باری باری ہر منظر یاد آیا، اور اس کا دل چاہا وہ اڑ کر اپنے دیار میں پہنچ جائے۔ جہاں بچپن سے لے کر جوانی کے لمحات گزرے تھے۔ وہ بے چین ہو اٹھی ——

عباس کی مرضی بالکل نہ تھی کہ وہ اس شادی میں شریک ہو۔ کیوں کہ ثروت بیگم کو دوبارہ اپنانے کے بعد عباس نے اپنے اور اس کے تمام رشتہ داروں سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ مگر ثروت بیگم کی ضد تھی کہ وہ ضرور جائے گی۔ اس موضوع کو لے کر عباس سے اس کی کافی طویل بحث اور نوک جھونک ہوئی۔ آخر میں عباس نے دھمکی دی کہ۔

"اگر تم میری مرضی کے بغیر چلی گئیں تو دوبارہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا، بلکہ میری طرف سے اپنے آپ کو آزاد سمجھنا۔"

یہ آزادی اور رہائی کا مسئلہ اس کے لیے آنکھ مچولی جیسا تھا۔ دھمکی کی پروانہ کرتے ہوئے وہ غصہ کی حالت میں گھر سے نکل پڑی۔ سفر، پھر گھر،

پھر رشتہ داروں کا ہجوم

بھولی بسری یادوں کے نرم سائے، وہ کھو کے رہ گئی۔

اور ایک دن اس بھیڑ میں اسے رحمت نظر آگیا۔ دل جیسے سینے سے باہر نکل کر دھڑکنے لگا ہو —— رحمت نے اس سے ایک ملاقات کی درخواست کی۔ وہ انکار نہ کر سکی۔ اگلے روز نجو خالہ کے مکان میں ان کی ملاقات ہوئی۔

گلے، شکوے،

آنسو،

پشیمانی،

مجبوریاں،

بے بسی،

التجا! ان تمام جذباتی مراحل سے گزر کر رحمت میاں نے اپنا سر ثروت بیگم کے

قدموں پر رکھ دیا۔

"میں بے وفا نہیں ہوں ثروت! میں تمہارے پاس بمبئی آنے کے حالات پیدا کر رہا تھا تبھی مجھے پتہ چلا کہ تم دوبارہ اپنے خاوند کے پاس چلی گئی ہو۔ پھر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مگر تمھیں آج تک نہیں بھول سکا۔ تمھیں بھلانے کی کوشش میں کہاں کہاں نہیں بھٹکا۔ کس کس در پہ منتیں مرادیں نہیں مانگیں۔ تم وہ شئے نہیں ہو ثروت جسے بھلا دیا جائے تم محبت کی دیوی ہو۔ ایثار کی ملکہ ہو، تم میری زندگی کی وہ عورت ہو جس نے مجھے حیوانیت سے انسانیت کی طرف موڑا ہے۔"

جواب میں ثروت بیگم کی آنکھوں سے صرف آنسو بہتے رہے۔ جو محبت ایک آہنی انسان کو پگھلا سکتی ہے، بدل سکتی ہے۔ وہ ایک موم جیسی عورت کو پگھلنے سے کیسے روک سکتی تھی؟ ثروت بیگم پر رحمت میاں کی شخصیت کا جادو پھر اثر کر گیا ——— اور وہ ایک بار پھر بے حد قریب آ گئے۔ مگر اس بار ثروت بیگم نے رحمت کے بازو کو نوکیلے دانتوں سے زخمی نہیں کیا ———

ثروت بیگم نے خاوند کو اطلاع دے دی کہ اب وہ آزاد ہے اور ہمیشہ کے لیے رحمت کی ہو گئی ہے۔

رحمت نے ثروت بیگم کو اپنے گھر میں لا کر رکھا۔ بیوی کے لیے یہ ایک المیہ تھا۔ کوئی بھی عورت خوشی سے اپنی سوتن کہاں برداشت کرتی ہے۔ اولاد سے پہلے ہی محروم تھی، اب میاں کا پیار بھی تقسیم ہو گیا۔ اب اس کی جھولی میں خوشیاں کبھی کبھار بھیک کی طرح ڈال دی جاتیں۔ رات دن لڑائی جھگڑے کا نتیجہ یہ نکلا کہ رحمت میاں ثروت کو ساتھ لے کر بمبئی ہجرت کر گئے، اور وہیں سکونت اختیار کی۔ لوہے کی الماریوں کا بزنس تھا جو بمبئی میں فروغ پایا۔ مگر عروج اور زوال تو ہر شئے کے ساتھ ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ کاروبار میں بھاری نقصان کے بعد کارخانے بند ہو گئے، فلیٹ فروخت کر دینا پڑا۔ گھر کے برتن اور زیور تک رہن رکھ دیے گئے۔ جب تقدیر بگڑتی ہے تو بڑے سے بڑا رئیس بھی فٹ پاتھ پر آ جاتا ہے۔ اب ان کے لیے ایک ہی پناہ گاہ تھی۔ بمبئی کے ... نگر کا ایک چھوٹا سا جھونپڑا، جس کے

سامنے گندہ نالہ بہتا ہے۔ جس کے آس پاس مزدور طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ جہاں شراب پی کر ٹیکسی ڈرائیور اور علاقے کے بدنام لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کی ماں بہنوں کی روح کو ثواب پہنچاتے ہیں۔ کبھی کبھی چاقو، چھرے بھی نکل آتے ہیں۔ اس قدر بدنام ہے یہ بستی کہ شہر میں کہیں بھی فرقہ وارانہ فساد ہو پولیس یہیں کے لوگوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ پولیس کو کسی قاتل کی تلاش ہو تو انہیں جھونپڑوں میں چھاپے مارے جاتے ہیں ——

مگر میں نے دیکھا، اور محسوس کیا کہ ایسے تنگ جھونپڑے اور گندے ماحول میں رہ کر بھی ثروت بیگم اور رحمت میاں بہت خوش تھے۔ پہلے خاوند نے بات زیادہ آگے نہیں بڑھائی بس خاموشی اختیار کرلی۔ کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی جب ثروت بیگم اپنے پہلے خاوند اور بچوں کے پاس نہیں پہنچیں تو پڑوسیوں نے ٹوہ لینا اور کریدنا شروع کر دیا۔ عباس ایک باعزت آدمی تھے ان حملوں سے گھبرا گئے۔ آخر کب تک جھوٹ بولتے کہ ثروت بیگم میکہ جا کر بیمار پڑ گئیں اور ان کا وہیں علاج چل رہا ہے۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ دوسرے محلّہ میں شفٹ ہو جائیں۔ ایک روز اپنا فلیٹ فروخت کر دیا اور ایک ساحلی علاقے میں آباد ہو گئے۔

ادھر ثروت بیگم اور رحمت میاں اپنے آپ میں ایک خالی پن محسوس کر رہے تھے۔ محبت کی دنیا بس کر بھی اجڑی اجڑی لگتی تھی۔ کیوں کہ ان کا بیٹا جو ان کے پیار کی امانت تھا کسی بھی طرح ان کے ساتھ رہنے پر راضی نہ تھا۔ وہ اب بھی عباس کے گھر میں اور عباس کی زندگی میں شامل تھا۔ بڑا بیٹا غلط راہ پر پڑ گیا تھا۔ چھوٹے سے ہی زیادہ لگاؤ اور چاہت تھی۔ جیسے وہ ان کے بڑھاپے کی آخری چھڑی ہو، اور رحمت کا یہ عالم تھا کہ بیٹے کے فراق میں پلنگ تھام لیا تھا۔ ثروت بھی رات دن آنسو بہاتی رہتی آخر ایک روز دونوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بیٹے شمشاد کو یہ راز بتا دینا چاہیے کہ وہ عباس نہیں بلکہ رحمت کا بیٹا ہے۔

ثروت بیگم اکثر و بیشتر میرے گھر پر اپنے بیٹے شمشاد کو بلا کر ملا کرتی تھیں۔ اور وہ بڑا امتحانی لمحہ تھا جب اس انکشاف کے لیے وہ خط بھی مجھ سے ہی لکھوایا گیا جس میں ماضی کی

تمام کہانی دہرائی گئی تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے اس خط کو پڑھ کر شمشاد پر ایک ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اپنے سر کے بال نوچ نوچ کر روتا اور کہتا تھا۔

"امی! کاش یہ راز مجھے کبھی نہ بتاتیں۔ میرے پاس صرف ایک باپ ہی تو تھا آج اسے بھی چھین لیا——"

"نہیں میرے بچے، تیرا باپ تو اپنی تمام محبتیں، شفقتیں لیے تیرا منتظر ہے تو رحمت کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس کی آنکھوں کا نور ہے، اس کی امیدوں کا تارا ہے۔ تو اپنے باپ کی خالی جھولی بھر دے میرے بیٹے! رحمت نے تیرے لیے اک جہان چھوڑا ہے——"

اور شمشاد نے روتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"آج کے بعد سے میں تمہارا بیٹا بھی نہیں، صرف اور صرف عباس کا بیٹا ہوں۔"

شمشاد چلا گیا، ایک ماں روتی بلکتی اور تڑپتی رہ گئی—— ممتا کے سارے واسطے بیکار ہو چکے تھے۔ خون سفید ہو گیا تھا، یا رگوں میں اپنی تاثیر کھو چکا تھا۔ قدرت نے یہاں ثابت کر دیا تھا کہ دل کے رشتے عظیم ہوتے ہیں۔

اب شمشاد اپنا گھر بسا چکا ہے۔ ایک چاند سی بیوی اور ننھے ننھے پھول اس کے گھر کی رونق ہیں۔ زندگی کا ہر سکھ اسے میسر ہے، مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسے سو گئی ہو، کم بولتا ہے، کم سوتا ہے، کم ہنستا ہے۔ جب بھی سنتا ہے کہ ماں بیمار ہے یا کسی تکلیف میں ہے تڑپ اٹھتا ہے مگر اس سے ملنے کبھی نہیں جاتا۔ ہاں ممتا کی ماری ثروت بیگم البتہ اس کے گھر پر آ جایا کرتی ہے۔ وہ جب بھی اپنے بیٹے بہو اور پوتے سے ملنے آتی ہے، کبھی دہی بڑے، کبھی مسور پلاؤ کبھی قورمہ پکا کر لاتی ہے——

عباس نے حج کرنے کے بعد اب گھر کی ایک کوٹھری میں خود کو مصروف عبادت کر لیا ہے۔ عباس اور ثروت بیگم کبھی روبرو نہیں ہوتے۔ ہاں ثروت کے آنے کی ان کو خبر ضرور ہو جاتی ہے۔ جب ثروت بیگم کی لائی ہوئی کھانے کی کوئی چیز ان کے دستر خوان پر

رکھی جاتی ہے تو وہ بیٹے سے کہتے ہیں ——

"اس میں تمھاری امی کے ہاتھوں کی خوشبو آرہی ہے۔"

عباس کے تخیل میں ثروت کی خوشبو اب تک قید ہے۔

خوشبوئیں کبھی مرتی نہیں!

چاہے وہ رحمت کے پیکر میں ہوں یا ثروت، یا عباس کے!!

وہ چہرا میرا چہرا تھا

قدرت نے شاید ایک ہی مٹی سے دو بت گھڑے تھے۔ یا پھر ایک ہی عورت کے دو نام رکھ دیے تھے۔ کتنی مماثلت تھی اس کی اور میری زندگی میں، جیسے وہ میرا آئینہ تھی۔ جب بھی دیکھا، اس میں اپنی ہی تصویر نظر آئی۔ وہی غم، وہی درد، وہی زندگی کی گھٹن، وہی جلتے ہوئے شب و روز، وہی بے معنی سا چہرا۔

اس آئینے کا نام تھا، مینا کماری، فلم اداکارہ مینا کماری جس نے اداکاری کے میدان سے لے کر حقیقت کے تپتے ہوئے ریگ زاروں تک صرف زہر پیا ہے، بوند بوند کر کے۔ اور سانسیں گن گن کر زندگی کو جھیلا ہے۔ اس کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی مگر کسی سے پڑھی نہ گئی۔ وہ ایک سادہ لوح پیار کی پیاسی عورت تھی مگر اس کے درد کو کوئی سمجھ نہ سکا۔ جو بھی اس کے قریب آیا صرف اپنی پیاس لے کر۔ خود سیراب ہوا اور اسے تشنہ لب چھوڑ گیا۔ وہ زندگی بھر اپنے من کے صحرا میں بھٹکتی رہی۔ پیاس کی شدت جب تڑپ اختیار کرتی ہے اور انسان موت کے قریب ہو جاتا ہے تو اس وقت یہ نہیں سوچتا کہ اس کے سامنے جو پانی ہے وہ گندا ہے یا پاک۔ اسے تو صرف پانی سے تعلق ہوتا ہے جو اسے سیراب کر دے۔ اسے زندگی بخش دے۔ مینا کماری کے ہونٹوں سے شراب بھی ایسے ہی بے بسی کے عالم میں لگی تھی۔ جو دھیرے دھیرے عادت بنتی چلی گئی۔ بعد میں جس نے موت کی شکل اختیار کر لی۔

ہندوستان کی یہ مشہور اداکارہ جسے "ٹریجڈی کوئن" کہا جاتا ہے اپنے غموں سے جاں بلب تھی مگر کوئی ہاتھ ایسا نہ تھا جو بڑھ کر اسے تھام لیتا، اسے سہارا دیتا، اس کا مسیحا بنتا، یوں تو اس کی زندگی میں بہت آئے مگر وہ صرف اس کے جسم کے سیاح تھے۔ کسی کو فرصت نہ تھی کہ اس کی تار تار روح کو محسوس کرتا۔ اس کی زندگی میں آنے والے سبھی مرد شادی شدہ تھے جو خود اپنی بیویوں سے بے وفائی کر کے اس کے پاس آئے تھے۔ اس سے کیوں کر وفا نبھاتے۔ دو قدم ساتھ چل کر ہر کسی نے راہ بدل لی، اور وہ عمر بھر تن اور من کی بھٹی میں سلگتی رہی۔

ہر ابتداء کی ایک انتہا ہوتی ہے مارچ 1972 میں اس دردناک کہانی کا بھی اختتام ہو گیا، جیسے ہی خبر ملی کہ مینا کماری کا انتقال ہو گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"چلو کوئی منزل تو ملی اسے۔"

مگر ایک مینا کماری کے مرنے سے کہانی ختم نہیں ہوتی، جب تک یہ دنیا قائم ہے عورت کبھی مینا، کبھی میرا بن کر تاریخ کے اوراق میں اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ دکھی عورت مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے، مگر مینا کماری کا معاملہ سب سے جدا ہے۔ اس نے مجھے متاثر ہی نہیں کیا میری روح سے ایک مضبوط رشتہ قائم کر لیا۔ اور اس لگاؤ کو آج تک میں کوئی نام نہیں دے پائی۔

دنیا سے جانے والے دلوں سے نہیں جاتے۔ کچھ لوگوں کی موت تو صرف دکھاوے کے لئے ہوتی ہے۔ لگتا ہے اچانک پردے کے پیچھے چھپ گئے ہوں، اور ایسے لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، اسی طرح وہ بھی زندہ ہے، زندہ رہے گی۔ اس کے مرنے کا کبھی یقین نہیں آتا۔ آج بھی لگتا ہے اس کی مختلف پرچھائیوں میں، میں گھری ہوئی ہوں۔ جیسے ہر پل وہ ساتھ رہتی ہو۔

1972 ہی کا ذکر ہے۔ موت کے کچھ دنوں بعد میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی میرے پاس آئی۔ خاموش سی، اداس اداس، مجھے غور سے دیکھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں بے چین ہو اٹھی۔ اسی روز شام کو عصر کے وقت میں پہلی

بار "رحمت آباد" قبرستان گئی جو شیعہ قبرستان ہے۔ جہاں میناکماری عرف مہ جبین کی آخری آرام گاہ ہے۔ قبرستان میں قدم رکھتے ہی مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ ایسا لگا ایک روح کسی قبر میں اپنا جسم تلاش کرنے آئی ہو۔ وہاں کے گورکن سے معلوم کر کے میناکماری کی قبر پر پہنچی۔ ابھی پختہ نہیں بنی تھی۔ قبر کے سرہانے ایک طاق تھا۔ جس کے محراب سیاہ ہو رہے تھے اور جس میں ایک ادھ جلی بے نور شمع رکھی ہوئی تھی۔ قبر کے پاس کچھ مرجھائے گلاب پڑے تھے۔ سرہانے جو کتبہ تھا اس پر میناکماری کا ہی شعر درج تھا۔

راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

میں نے فاتحہ پڑھی۔ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ آنسو تھم گئے۔ مگر دل بکھر رہا تھا۔ سامنے گورکن کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ موم بتی کون جلاتا ہے؟"

"ہم ہی جلاتے ہیں، قرآن بھی روز پڑھواتے ہیں۔ میناجی کی بہن ہیں نا خورشید آپا وہ اس کام کے لئے ہمیں تنخواہ دیتی ہیں۔"

"یہاں کوئی آتا نہیں؟"

"بس کبھی کبھی خورشید آپا آجاتی ہیں۔" گورکن نے جواب دیا۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان کی مشہور اداکارہ جس کی فلمیں دیکھنے کے لئے سینما ہال پر عوام کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا، جس کے انٹرویو لینے کے لئے پریس والے آگے پیچھے بھاگتے نظر آتے تھے۔ جو سڑک پر بے پردہ نکل جائے تو اس کے مداحوں کی بھیڑ پر قابو پانا مشکل ہوتا تھا۔ آج وہی میناکماری عظیم اداکارہ قبرستان کے سناٹوں میں تہہ پڑی تھی۔ اس کی قبر پر کوئی دیا جلانے والا نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر جل جل کر دوسروں کو روشنی بانٹتی رہی اور آج اس کی قبر پر کرائے کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی لو میں نہ محبت تھی، نہ عقیدت، وہاں تو صرف ایک رسم تھی۔ میں چلنے لگی تو گورکن نے پوچھا۔

"کیا آپ میناکماری کی رشتہ دار ہیں۔؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا: "شاید"! اس سادہ لوح کو کیا بتاتی کہ میرا اس کا روحانی رشتہ ہے۔ شاید اس وقت سے جب ہم آسمان پر "عالم ارواح" میں ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ قبرستان سے نکلتے وقت ایک بار پھر مینا کماری کی قبر کو دیکھا، اس وقت ان کے یہ اشعار میرے ہونٹوں پر جل اٹھے۔

چاند تنہا ہے، آسماں تنہا
دل ملا ہے کہاں کہاں تنہا
جلتی بجھتی سی روشنی کے پرے
سمٹا سمٹا سا اک مکاں تنہا

اس کے بعد یہ سمٹا سمٹا سا مکاں میرے اندر دور دور تک پھیلتا چلا گیا! اب ہر دوسرے تیسرے دن مینا کماری کی قبر پر حاضری میرا معمول بن گیا تھا۔

اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک میں بمبئی میں رہی۔ 1980 میں بمبئی کو خیر آباد کہا۔ دلی میں رہ کر ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ مینا کماری کی قبر کو "رحمت آباد" قبرستان سے اپنے ساتھ اٹھا لائی ہوں۔ اس سلسلے کا ایک وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر پائی۔

جب میں آخری بار مینا کماری کی قبر پر گئی تھی مغرب اور عشاء کا درمیانی وقفہ تھا۔ میں اپنے ملازم کو ساتھ لے گئی تھی۔ جو گیٹ کے باہر دور کھڑا تھا۔ کچھ لوگ جانے کیوں قبرستان سے اس قدر ڈرتے ہیں۔ جب کہ انہیں معلوم ہے کہ بے چارے مردے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ڈرنا ہے تو زندہ انسانوں سے ڈرو۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ اس روز قبر پر میں بالکل تنہا تھی۔ آس پاس دوسرا کوئی نہ تھا۔ فاتحہ پڑھ کر حسبِ عادت اہلِ قبر سے مخاطب ہوئی۔ مگر جملہ پورا ابھی نہیں کر پائی تھی کہ اچانک قبر کے ابھاروں میں جو کچی مٹی کے تھے حرکت پیدا ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے پوری قبر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کروٹ کے انداز میں جنبش کر گئی۔ تھوڑا ذہنی جھٹکا تو لگا مگر خوفزدہ نہیں ہوئی۔ میں گھر آ گئی۔

اس واقعہ کے بارے میں اکثر سوچتی ہوں، اور آج بھی حیرت میں ہوں کہ وہ کیسا لرزہ تھا؟

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے !!

وہ عورت میری کون تھی؟

آج پھر ماضی کے دھندلے نقوش میں کچھ عکس واضح ہو رہے ہیں بلکہ ستاروں کی طرح چمکنے لگے ہیں۔

وہ بھی میری ہی طرح ایک عورت تھی۔ بالکل میرے جیسی۔ اس کا نام لکھنے کی شاید ضرورت نہیں بس، وہ عورت تھی! عورت کا ایک ہی نام ہوتا ہے، دکھ۔ شکلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ وہ دکھی تھی۔ مضطرب تھی۔ پریشان تھی اور اکیلی تھی۔ بالکل تنہا۔ میری طرح۔ وہ روتی تو میں اپنی آنکھیں آئینے میں دیکھتی کہ پلکوں کا کوئی کونہ بھیگا تو نہیں ہے ——————!

اس نے بھی ایک خواب دیکھا تھا۔ اور پھر۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں بھی خود ہی سمیٹی تھیں۔ اس کا کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ کسی کی نہیں تھی۔ یا شاید کسی کی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ کسی کی ہونے کا کرب سہہ چکی تھی۔ اب وہ اپنی ذات سے کسی کی وابستگی نہیں چاہتی تھی۔ اور ایسے میں ایک شخص، جو اجنبی تھا۔ جس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتی تھی اس کی طرف ہمدردیاں لے کر بڑھ رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ وہ بالکل لاعلم تھی۔ اسے بڑی کوفت ہوتی جب وہ اجنبی اس کے گھر کے سامنے بس اسٹینڈ پر خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہتا۔ گھنٹوں، پہروں، کبھی کبھی مسلسل رات اور دن، بسیں آکر رکتیں اور آگے بڑھ جاتیں اور وہ ریلنگ کا سہارا لیے اپنی جگہ ساکت رہتا۔ جب کھڑکی بند ہو جاتی، پردے

گر جاتے تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹتا۔ اس کے گھر کے در و دیوار کو دیکھتا رہتا۔ اس کے اندر جانے کیسا سفر شروع ہو چکا تھا۔ جس کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ ایک ہی مقام پر چٹان کی طرح جم سا گیا تھا۔ شاید وہ پاگل تھا۔ جنونی تھا۔ یا خبطی تھا۔ لوگوں کی نظریں اس کے تعاقب میں لگ گئیں۔ وہ آس پاس کے لوگوں کے لئے موضوع بحث بن گیا۔ مگر وہ بدنام ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہ قطعی پسند نہ تھا کہ کوئی شخص ٹکٹکی باندھ کر ہر وقت اسکی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہے۔ اس سے رہا نہ گیا، ایک روز اس اجنبی کو ڈانٹ دیا۔ نصیحتیں، دھمکیاں، اور بس اسٹینڈ پر بے مقصد بیٹھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ بھلا وہ اس کا کیا لگتا ہے۔ اس کے لئے خود کو رسوا کیوں کرتی؟ ویسے بھی اسے سماج سے کوئی نیک نامی کی سند نہیں ملی تھی۔ وہ بیزار تھی کہ اجنبی اس کے پیچھے کیوں پڑا ہے؟ سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے اس سے پہلے وہ پہنچ جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا وہ ندی کا باندھ ہے جو کب کا ٹوٹ چکا ہے۔ اسے روکنا جیسے اب اس کے بس کی بات نہ رہی ہو۔ مگر اسے تو مرد ذات سے ہی نفرت تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ کوئی مرد کسی عورت کا دیوانہ نہیں ہوتا۔ ان کی دیوانگی ایک خاص وقت تک کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ بستر پر کتے کی طرح دم ہلانا بعد میں شیر کی مانند عورت کی بوٹیاں نوچنے والے مرد کا ہی تجربہ تھا اسے۔ اس کی نظر میں مردوں کی کوئی اچھی Image نہیں تھی۔ اس کے احساس کی سرحد پر کوئی مرد دیر تک نہیں ٹھہرتا تھا، بلکہ اپنے قریب آنے والے ہر مرد کو وہ انتقام کی آگ میں جھونک دینا چاہتی تھی۔

عورت جب باغی ہو جائے تو اسے روکنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ بالکل سیلاب زدہ ندی کی طرح ہوتی ہے جس کا بہاؤ کسی بھی سمت رخ کر لیتا ہے۔ اس کے راستے میں مندر، مسجد اور گندے نالے بھی آ جاتے ہیں۔ اس کی منزل کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ وہ بھی بپھری ہوئی ندی کی طرح بہی جا رہی تھی۔ بغیر سوچے، بغیر سمجھے۔

وہ فنکار نہیں تھی مگر فن کی پجاری تھی۔ موسیقی اس کے دل کا سکون تھی۔ رقاصہ کے پیر میں گھنگرو اسے بہت بھلے لگتے تھے۔ وہ کہتی ان کی جھنکار میں درد کی ایک لے

ہے۔ایک فریاد ہے۔ فلم دیکھتی تو گھنگرو کی آواز اسے سحر زدہ کر دیتی۔

جانے کب چپکے سے ایک روز وہ بازار سے گھنگروں خرید لائی۔ پیروں میں باندھا۔ مگر گھنگھروؤں سے پہلے اس کے گھر کے در و دیوار بول اٹھے۔

"نہیں ایسا ہر گز مت کرنا۔ گھنگرو کی آواز تمہاری رسوائی کا باعث بن جائے گی۔ عورت کے لئے تو ہر راستہ رسوائی کی طرف ہی جاتا ہے۔" اس کے لہجے میں بغاوت کا زہر پھیل چکا تھا۔ ضمیر نے پھر ایک دفعہ مشورہ دیا۔ گھنگرو سے عشق ہے تو میرا بنو، اور نکل جاؤ گھر سے۔ سماج سے دور کہیں۔ جہاں کوئی نہ ہو۔ جنگل جنگل بن بن پھرو۔ جیسے میرا بھٹکی تھی۔

اور وہ نکل پڑی۔ بے تحاشہ بھاگتی رہی، بھاگتی رہی۔اسے کوئی سمت نہ ملی۔ جیسے جنگل کے تمام راستوں پر پہرے لگ گئے ہوں۔یا میرا کے بن میں اب آدم خوروں کا بسیرا ہو گیا ہو۔

وہ لوٹ آئی۔ فن کی پیاس لیے۔ گھنگرو کی بے قراری سمیٹے۔اسے ایک ڈانسنگ اسکول کا پتہ ملا۔جو بازارِ حسن کی ایک بدنام گلی جسے "پون پل" کہتے ہیں، میں تھا۔ وہ بلا جھجک وہاں پہنچ گئی۔ 'کانگریس ہاؤس' کی تیسری منزل پر ڈانسنگ اسکول تھا۔ جس کا مالک تھا اتم کمار۔ ڈانس ماسٹر۔ جس کا فن شہر بھر میں مشہور تھا۔ جس کے یہاں طوائف زادیوں سے لے کر اسٹیج اداکار اور فلم انڈسٹری کی لڑکیاں بھی رقص سیکھنے آیا کرتی تھیں۔ یہ اسکول ایک ہال نما کمرے کی شکل میں تھا۔اس سے متصل ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جہاں کرشن جی کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ یعنی وہ ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ نچلی دونوں منزلوں میں مجرا کرنے والی طوائفیں رہتی تھیں۔اس اسکول کے چھوٹے سے مندر میں ایک ضعیف عورت جو اتم کمار کی ماں تھی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس کرشن جی کی مورتی کے سامنے پوجا میں مصروف رہتی۔ یہ سب دیکھ کر لگتا گندے نالے کی سطح پر کسی نے مصلیٰ بچھا دیا ہو۔

رقص کی ابتدائی تعلیم شروع ہو گئی۔

قطرہ سمندر بننے کو مچل اٹھا۔ اسکول کے باہر سامنے پل کی ریلنگ پکڑے وہ اب

بھی اسے گھورتا رہتا۔ سہارے کے لئے اسے ہر جگہ ریلنگ مل جایا کرتی تھی۔ وہ اس کے تعاقب میں یہاں تک آن پہنچا تھا۔ ہال کی کھڑکی سے اندر کا سارا منظر باہر والوں کو نظر آتا تھا۔ اور اس موقع کا وہ بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مگر اب اس کا چہرہ بجھا بجھا اور کبھی کبھی غصہ سے تمتمایا ہوا لگتا۔ مگر کیوں؟ اسے کیوں برا لگ رہا تھا؟ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، خود مختار تھی۔ . . . . . . اسے کیا حق تھا اس کے معاملے میں دخل اندازی کا۔ اگر وہ کوئی سوشل ورکر تھا تو کوئی دوسرا گھر دیکھے۔ ہمارے معاشرے میں ہر عورت ناچ رہی ہے۔ کوئی گھنگرو باندھ کر، کوئی بغیر آواز کے، کوئی اتم کمار کے سبق پر، کوئی خاوند کے اشارے پر، کوئی اولاد کی محبت میں، کوئی ظالم کے خوف سے، رقص ہی عورت کا مقدر ہے۔ جب وہ ناچنا بند کر دیتی ہے تو وہ ساکت کر دی جاتی ہے اور پھینک دی جاتی ہے۔ کبھی آگ میں، کبھی پانی میں، کبھی قبر میں۔

گرمی، برسات، سردیاں سارے موسم گزر گئے۔ گھنگرو کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا گیا۔ اب وہ گھنگرو کی زبان سمجھنے لگی تھی۔ اشاروں کو پہچاننے لگی تھی۔ اتم کمار خوش ہو کر کہتے۔

"تم نے اتنے کم دنوں میں کافی سیکھ لیا ہے۔"

اور اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ رینگ جاتی۔ بے معنی سی، بے نام سی۔ مگر اچانک ایک روز۔

دل میں درد!

اسپتال!

پھر مکمل بیڈ ریسٹ!

اس کے بعد۔ ایک دھماکہ!

اتم کمار نے کہا۔ "تم اب ڈانس نہیں کر سکتیں۔ تمہاری صحت کے لئے یہ بہت مضر ہے۔"

ایک چراغ سرِ شام بجھ گیا۔ گھنگرو ٹوٹ گئے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح انہیں

سمیٹ کر رکھ دیا۔ مگر ٹوٹی ہوئی چیزوں سے بھی ایک تعلق ہوتا ہے۔ ایک رشتہ ہوتا ہے۔
اس نے اپنے آپ کو پھر ایک تاریک کمرے میں قید کر لیا۔ وہ کھڑکی بھی مستقل بند رہنے لگی جہاں سے ایک وحشت زدہ کی صدائیں اسے آواز دیا کرتی تھیں۔ اب اسے ہر آواز سے نفرت تھی۔ ہر آہٹ سے گھٹن ہوتی۔ کتنی مشابہت تھی اس عورت میں میری۔ جب اس سے ملتی لگتا وہ میرے کردار کا آئینہ ہو۔!

دیکھوا نہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

میری عقل حیران تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

ہوا یوں کہ اس رات میں اپنی دوست رابعہ کے گھر پر گورے گاؤں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ان کا مکان چال ٹائپ کا تھا جسے بمبئی کی زبان میں "بیٹھی چال" کہتے ہیں۔ یہ پولیس یا ریلوے کوارٹر جیسے ہوتے ہیں۔ ایک کمرے سے متصل دوسرے مکان کا کمرہ ہوتا ہے اور اکثر پرٹیشن والی دیوار میں بلندی پر جا کر چھوٹا سا روشن دان بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے برابر والے کمرے کی آوازیں صاف سنی جا سکتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ دوسروں کے گھروں کی باتیں سننا اخلاقی جرم ہے مگر جب آوازیں سماعت سے خود ٹکرائیں تو مجبوراً سننا پڑتا ہے۔

میں ابھی اپنے بستر پر جاگ رہی تھی۔ رات کے تقریباً بارہ بجے تھے کہ برابر والے کمرے سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ پھر لگا کسی نے چیخنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میں ڈر گئی۔ سہم کر رابعہ سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

وہ بولیں "برابر والے پڑوسی امجد بھائی کی آج شادی ہوئی ہے سہاگ رات ہے"۔

"سہاگ رات؟"

"ہاں! لڑکی کمسن ہے نا اسی لیے "

اسی لمحہ دوسری کربناک چیخ گونجی، اور مجھے فلم ”بینڈٹ کوئن“ کی کمسن دلہن پھولن دیوی یاد آگئی۔ جس نے ہال میں جمع Audience کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، اور اس سین پر چھچھورے ناظرین کی سیٹیاں تک سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

مگر چال کے لوگ شاید اس سے بھی زیادہ سنجیدہ یا پھر بے حس تھے۔ چیخ پر چیخ عرش کو ہلا رہی تھی اور آس پاس کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں خاموش تھے۔ لگتا تھا جیسے کوئی قصائی بکرا ذبح کر رہا ہو۔

میری نیند اڑ چکی تھی۔ ویسے بھی میں بہت کم سوتی ہوں، چوبیس گھنٹوں میں صرف ڈھائی تین گھنٹے۔ میرا جی چاہا کہ اس شخص کا گلا گھونٹ دوں جو عورت پر رحم نہیں کرتا۔ وہ اس کی بیوی ہے کبھی بھی اس سے فیض اٹھا سکتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ آج ہی رات اپنے مرد ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کرلے۔

رابعہ نے مجھے بتایا کہ امجد کی یہ تیسری شادی ہے۔ پہلے کی دونوں بیویاں سال کے اندر ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بہت شہوی اور عیاش مرد ہے۔

”کمبخت طوائف کے کوٹھے پر کیوں نہیں چلا جاتا۔“ میں نے جل کر کہا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند کہاں؟ رابعہ سو گئیں اور میں خیالوں کے تانے بانے میں الجھی جانے کب دبے قدموں سے اپنے گاؤں پہنچ گئی، اور وہاں کے سیدھے سادے بھولے بھالے مردوں سے ان شہری درندوں کا موازنہ کیا تو کئی پیارے پیارے لمحوں کے ساتھ ایک واقعہ یاد آتا چلا گیا۔

میں اپنے ماموں کے منھ بولے بیٹے اسلام کی شادی میں شرکت کے لئے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ سہاگ رات کے پھولوں بھرے منظر میں رضوانہ جو اسلام کی منکوحہ تھی سرخ گٹھری بنی پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رات کے دو بج رہے تھے اور دولہے میاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ایسا تو نہیں کہ وہ زبردستی اس کے پلے باندھ دی گئی ہو۔ رضوانہ طرح طرح کے اندیشوں میں گھری جا رہی تھی۔ کئی راتوں سے جاگی آنکھیں نیند سے کوسوں دور تھیں۔ وہ سونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ آج کی رات جو سو

گیا وہ زندگی بھر جاگتا رہے گا۔

آنکھوں میں سجے خواب اب دھیرے دھیرے بکھرنے لگے تھے۔ قریب تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی کمرے میں آہٹ ہوئی اور اس کا شریک سفر کمرے میں داخل ہوا۔ شرم اور گھبراہٹ سے رضوانہ کے ہونٹوں پر ایک ایسی کپکپی طاری ہو گئی جیسے دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی سردیوں میں کوئی برفیلی ہوا جسم کو چھو جائے۔ وہ آنکھیں بند کیے منتظر تھی اس ایک لمحہ کی جب سینے میں دل اپنے دھڑکنے کا انداز بدل دیتا ہے۔ کافی دیر ہو گئی اور آہٹ نہ ہوئی تب چپکے سے اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھا اور سہم گئی۔ اسلام اس کی طرف پشت کیے ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ یہ منظر اور خاوند کی بے اعتنائی دیکھ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ دولہے میاں کا اس کے قرب سے کترانا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوب صورت، پڑھی لکھی، ایک سلیقہ مند لڑکی تھی، جو اپنے ساتھ جہیز بھی بہت لائی تھی۔ پھر کیا کمی تھی اس میں کہ اس کے لیے وہ سگریٹ سے زیادہ حقیر شئے بن گئی تھی۔

بستر پر بکھری گلاب کی پنکھڑیاں جیسے اس کو طعنہ دے رہی تھیں، اور گھونگھٹ شرمندہ ہو رہا تھا، عورت چاہے کتنی ہی بے صبر ہو ضبط کی چادر اس کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ پہل مرد ہی کرتا ہے۔

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک بار پھر دیکھا، دولہے میاں اب تک سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ اس بار جانے کیوں اسے جنسی دواخانوں کے اشتہار کے کئی چہرے یاد آنے لگے۔ اور یہ خیال آتے ہی وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔

رات بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں گزر گئی تھی۔ اب بھی اسلام کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بے خبر سو رہا تھا۔

مرد کتنا ہی حسین ہو اگر محبت سے خالی ہو تو اس کا حسن بے اثر ہوتا ہے۔ اگلے روز دوپہر سے پہلے رضوانہ اپنے میکے چلی گئی۔ سہیلیوں کی روایتی چھیڑ چھاڑ پر وہ ضبط نہ کر سکی، دل کا طوفان جب زبان پر آیا تو پورے گھر میں ہلچل مچ گئی، اور دھیرے دھیرے بات پورے خاندان میں پھیل گئی۔

جب اسلام سے پوچھا گیا تو وہ شرم سے سرخ ہو گیا اور نظریں نیچی کر کے کہا۔ "میں تو صرف شرم کی وجہ سے بیوی کے قریب نہ جا سکا۔"

دراصل وہ ایک سادہ لوح شریف، دیہاتی نوجوان تھا۔ عورت کو برتنے کے معاملہ میں بالکل اناڑی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا ورنہ ایسے معاملات کی رہنمائی کے لئے آج کل دوست ہی کافی ہوتے ہیں۔

آج وہی شرمیلا نوجوان کئی بچوں کا باپ ہے۔ مگر کرسی پر بیٹھ کر سہاگ رات گزارنے کا واقعہ آج تک یادگار کی طرح قائم ہے۔

جن آنکھوں نے اتنا پاکیزہ ماحول دیکھا ہو ایسے ایسے فرشتہ صفت لوگوں کے درمیان بچپن گزارا ہو وہ اب ان شہری درندوں کو دیکھ کر صرف وقت کا ماتم ہی کر سکتی ہیں۔

پرندوں کی چہچہاہٹ پر میں نے چونک کر گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ لڑکی تمام رات قربانی کے بکرے کی طرح چلاتی رہی تھی۔ صبح آس پاس کے لوگوں نے کچھ اعتراضات اٹھائے۔ اس طرح کی بے شرمی اور بے ہودگیاں کسی بھی معاشرے میں قابل برداشت نہیں ہوتیں۔ شام ہونے سے پہلے لڑکی کے میکے والے آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس بھی آ گئی۔ سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ ہر طرف تھو تھو ہونے لگی۔ لڑکی نے جو بیان دیا اسے سن کر ہر نظر شرم سے جھک گئی۔ دراصل وہ اغلام باز تھا۔ جنون کی حد تک اذیت پسند اور ظالم، اسی دن لڑکی نے طلاق حاصل کر لی۔

مگر آج ہمارے معاشرے میں کتنی ہی عورتیں ایسی ہیں جو مرد کے اس جبر و تشدد کا شکار ہیں۔ چاہ کر بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتیں۔ کہیں پر بے سہارگی آڑے آتی ہے۔ کہیں بچوں کی محبت درمیان میں حائل ہوتی ہے۔ اور کہیں شوہر پر اتنی فریفتہ ہوتی ہے کہ اس کی اس ناجائز خواہش کو پوری کرتی ہے۔ جب کہ قرآن پاک میں صاف صاف ارشاد ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم پر اسی فعل بد کی وجہ سے عذاب الٰہی نازل ہوا تھا، اور پتھروں کی بارش سے وہ سب ہلاک ہوئے تھے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ اور مجھے یاد آ رہا ہے۔ لکھ رہی ہوں شاید اس عبرتناک

داستان سے کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ مل جائے۔

اب سے پچیس سال پہلے بنارس کے ایک مشہور علاقے میں ادریس نامی ایک شخص تھا (شاید اب بھی ہو) محلّہ کے معتبر اور شریف لوگوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اچھا کاروبار، بیوی، بچے، مکان، دکان، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر پتہ نہیں کب اور کس طرح اسے یہ بری لت پڑ گئی، ایک لڑکا جو عمر میں اس کے بیٹے سے بھی چھوٹا تھا وہ اس کا مفعول بن گیا۔ کہتے ہیں یہ چسکہ اتنا برا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے خوبصورت سے خوبصورت پر شباب کمسن لڑکیاں بھی ہیچ لگتی ہیں۔ ایسے لوگ ان کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ گناہ جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی پر کشش لگتا ہے۔

دھیرے دھیرے گھر والوں کو بھی اس تعلق کا علم ہو گیا۔ گھر میں تین جوان بیٹیاں، دو بیٹے، اسے کسی کا بھی لحاظ نہ رہا۔ اس بات کو لے کر ہر روز گھر میں ایک ہنگامہ رہتا۔ بیوی نے لاکھ کوشش کر لی مگر میاں کے سر سے یہ بھوت نہیں اترا، اور اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ اتنے سارے افراد کی موجودگی میں سر شام ہی ادریس اپنے معشوق خالد کو لے کر کمرے میں بند ہو جاتا۔ ضبط کا دریا کنارہ توڑ چکا تھا۔ بیوی نے مزاحمت کی۔ بات زیادہ بڑھ گئی۔ غصہ میں آ کر ادریس نے اپنی بیوی سکینہ کو تین طلاق دے دی۔

بیوی گھر سے تنہا گئی تھی۔ بچے اب بھی باپ کے پاس تھے۔ بچوں کے دل میں باپ کے لئے شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ سکینہ نے عدت کے ایام بھی پورے کر لیے۔ عورت کے دم سے ہی گھر کی تمام رونقیں ہیں گرہستی اجڑ گئی۔ شیرازہ بکھر گیا۔ سارا نظامِ خانہ درہم برہم ہو گیا جو بیوی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اس کے دور جانے سے ادریس اپنی زندگی میں بہت بڑی کمی اور خلاء محسوس کر رہے تھے۔ اپنے کئے پر بے حد پشیمان تھے۔

خاندان کے چند بزرگ بکھرے تنکوں کو یکجا کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ مسئلہ مفتی تک پہنچا اور حلالے کا فیصلہ ہوا۔ اس سلسلے میں کسی ایسے شخص کی تلاش شروع ہو گئی جو قابل اعتماد ہو۔ ادریس کی نظر معشوق پہ ٹھہری، جب کہ وہ عمر میں ادریس کے بیٹے سے بھی چھوٹا تھا۔ ایک رات کی تو بات تھی۔ صبح کو طلاق ہو جانا تھا۔ خالد سے زیادہ بھروسے

والا دوسرا کوئی نظر میں نہ تھا۔ لہٰذا نکاح ہو گیا۔ شب عروسی کے لئے اتفاق سے کمرہ بھی وہی منتخب ہوا جس میں ادریس اپنے گناہوں کا پیمانہ بھرتا رہا تھا۔ مقام بھی وہی تھا، مسافر بھی وہی تھا صرف راستہ بدل گیا تھا۔ قدرت کے فیصلے نرالے ہوتے ہیں۔ برابر والے کمرے میں ادریس اپنے آگ جیسے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ آج کی رات اس کے ضمیر پر بوجھ بن کر ٹھہر گئی تھی۔

دوسری طرف خالد اپنی نئی منزل کے نشے میں سرشار صبح نہ آنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ کسی عورت کا قرب اسے زندگی میں پہلی بار ملا تھا، یہ اور بات ہے کہ سکینہ اس سے عمر میں پچیس سال بڑی تھی، مگر آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ عورت اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ نعمتوں میں بڑی نعمت ہے۔ عورت کی محبت اور اس کے جسمانی نشیب و فراز میں بھٹک جانے سے کوئی مرد بچ نہیں سکتا۔ عورت کے قرب کی ایک ہی شب نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا، اور اسے لگا اب تک جو زندگی گزری تھی اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ چند لمحات نے اسے زندگی کے مفہوم سے آشنا کر دیا تھا۔ پیاس کے صحرا میں جیسے سمندر اتر آیا ہو، اور اس سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتا تھا۔ ابھرنے کے خیال سے ہی وہ سہم رہا تھا۔ خالد نے یہ بھی دیکھا کہ جس عورت کی آنکھوں میں ہمیشہ اپنے لیے نفرت پائی تھی آج وہاں پیار کی ایک ایسی جھلک تھی جو اسے بے خود بنا رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سکینہ سے پوچھا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کل صبح یہ بندھن توڑنے کی بجائے ہم اسے اور مضبوط کر لیں؟"

سکینہ نے چونک کر خالد کو دیکھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟" خالد نے پھر جواب مانگا۔ اب کے سکینہ کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی جو یہ کہہ رہی تھی۔ کیوں نہیں ایک بے وفا شوہر سے انتقام لینے کا اس سے بہتر موقعہ کہاں مل سکتا ہے؟

مگر سکینہ کے لب خاموش رہے۔ آنکھوں آنکھوں میں رات گزر گئی۔

فجر کی اذان پر خالد کا دل دھڑک اٹھا۔ آج کا سورج اس کے لئے اندھیرا لے کر

طلوع ہو رہا تھا۔ کاش کبھی سحر ہی نہ آتی۔

وکیل اور گواہوں کے ساتھ کچھ لوگ کمرے سے باہر ان کے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر بعد۔ خالد اور سکینہ بھی وہاں آن پہنچے۔ ادریس نے بے چینی سے کہا۔

''کارروائی شروع کریں۔''

تبھی خالد نے آگے بڑھ کر نہایت ٹھہرے ہوئے پر عزم لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ ہمیں طلاق کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ ایک پاکیزہ بندھن ہے جسے میں نے قبول کیا ہے۔ برسوں اندھیرے میں بھٹکنے کے بعد مجھے جو روشنی ملی ہے وہ میرے لیے مشعل راہ ہے۔ اور یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔''

حاضرین پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔

''سکینہ!'' ادریس چیخا۔ سکینہ سامنے آئی اور بولی۔

''ہاں، یہ بالکل سچ ہے اور اب تمہارے یہی سزا ہے کہ زندگی بھر کسی سے نظر ملا کر بات نہ کر سکو اور تم جیسے مرد تم سے عبرت حاصل کریں۔ میرے اس المیہ سے اگر سماج کا ایک مرد بھی سدھر جائے اور گناہ کو گناہ سمجھ کر ترک کر دے تو سمجھوں گی میری قربانی رائیگاں نہیں گئی''۔ وہ بلا توقف بولتی رہی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس واقعہ کو برسوں گزر چکے ہیں۔ خالد اور سکینہ بنارس چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں منتقل ہو گئے تھے بعد میں ان کا کیا ہوا اس کا علم نہیں۔ اس واقعہ سے کس نے عبرت حاصل کی، کس کس کی اصلاح ہوئی یہ تو میں نہیں جانتی، ہاں ادریس البتہ بدل گیا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ اولاد نے بھی اس سے ترکِ تعلق کر لیا۔ اب گھر کی ہر شئے اس کا مذاق اڑاتی۔ تنہائیاں دل کو جلانے لگیں۔ ہر محفل سے کٹ کے رہتے رہتے زندگی کی تمام امنگیں ختم ہو گئیں۔ اب نہ کوئی ہمدرد تھا نہ غمگسار، نہ دکھ سکھ میں ساتھ دینے والا ساتھی۔ ویران گھر تھا اور پشیمانی کا ایک سلگتا الاؤ جس میں وہ لمحہ لمحہ جل رہا تھا۔ زندگی کا یہ چہرہ اس سے دیکھا نہ گیا۔ آخر ایک دن اپنا تمام اثاثہ راہِ خدا میں دے کر اپنے محلے کی ایک مسجد میں گوشہ نشین ہو گیا۔ مسجد کا ایک چھوٹا سا حجرہ جانے کتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ادریس

کے لئے وہ ایک جہان بن گیا۔ مہینوں وہ حجرے سے باہر نہ نکلتا اور جب باہر آتا بھی تو اس طرح جیسے پانی سے مچھلی نکل کر خشکی میں لائی جائے تو بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی۔

اکثر ادریس کے بارے میں لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا"۔ آج وہی یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ یہ گھاٹ کنارے سب اسی کے ہیں جس نے ہماری تخلیق کی ہے ہم سب اس کی کہانی کے کردار ہیں۔ فاعلِ حقیقی کے ہاتھ میں ڈور ہے اور ہم سب کٹھ پتلی ہیں۔!

یاد رکھیں کیسے، کیسے بھولیں

یہ دس سال قبل کی بات ہے اس روز صبح سے دل بے انتہا پریشان اور بے چین تھا۔ کبھی کبھی بے سبب بھی اضطرابی حالت ہو جاتی ہے۔

شام ہوتے ہی خبر ملی کہ میرے ماموں انتقال فرما گئے۔ یعنی میرے ننہال کا آخری چراغ بھی بجھ گیا۔ اسی دن میں اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔ نانا اور نانی کے بعد دل کچھ اس طرح رنجیدہ رہا کہ گاؤں جانے کو کبھی جی نہیں چاہا۔ برسوں گزر گئے تھے گاؤں نہیں گئی تھی۔ عزیزوں کے خطوط آیا کرتے کہ ایک بار آ کر اپنی صورت دکھا جاؤ۔ لیکن میں ہمیشہ کتراتی رہی۔ اس خوف سے کہ محبتوں کے اس اجڑے دیار میں اب وہ آئینے نہیں رہے جس میں صورتیں نکھر جایا کرتی تھیں۔ وہ شفقتیں، وہ محبتیں، وہ ہاتھ جو صرف سر پر ہی نہیں دلوں پر بھی رکھے جاتے تھے کہیں دور موت کے اندھیروں میں گم ہو چکے تھے۔ میری جذباتی وابستگی صرف نانا، نانی سے تھی، مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اپنے ننہال کے ان تمام لوگوں کو بھول گئی تھی جو کسی نہ کسی موقعہ پر اکثر مجھے یاد کیا کرتے تھے۔ شہر کی چمک دمک میں بھی میرے ماضی کا ہر چراغ میرے اندر زندہ اور روشن تھا۔ کیسے بھولتی؟

میرا بچپن بھی ساتھ لے آیا
گاؤں سے جب بھی آ گیا کوئی

برسوں بعد میں اپنے گاؤں میں تھی، جس کے چپے چپے پر میرا بچپن لکھا ہوا ہے۔ جس کے ذرے ذرے میں میرے آنسو جذب ہیں۔ جن کی فضاؤں میں میری معصوم آہٹیں سوئی ہوئی ہیں۔ میں جس شئے پر نظر ڈالتی وہاں ماضی کے جزیرے ابھر آتے، اور لگتا ہر شئے مجھ سے گلہ کر رہی ہو۔ میں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتی، مگر منظر کہاں غائب ہوتے ہیں وہ تو بند آنکھوں میں بھی تعاقب کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد، نہا دھو کر فارغ ہوئی تو حسب معمول قبرستان کا رخ کیا، جو ہمارے گھر سے دو کلومیٹر کے فصلے پر ہے۔ ہمارے یہاں ہر کسی کا یہ معمول ہے کہ سفر سے آنے کے بعد سب سے پہلے اپنے خاندانی قبرستان جاتے ہیں، جہاں پر میر سرور صاحبؒ کا مزار پاک ہے حاضری دیتے ہیں پھر اہل خاندان کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ میر سرور صاحبؒ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ ہیں ان کا نام ہمارے خاندانی شجرے میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے نانا بتایا کرتے تھے کہ یہ دو بھائی تھے جو کسی زمانے میں عرب سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ایک بھائی نے شادی کر کے اپنا خاندان بڑھایا۔ دوسرے بھائی نے دنیا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔ قبرستان کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں وہ رات دن عبادت و مجاہدے میں مصروف رہا کرتے۔ مہینوں گاؤں والے ان کی شکل نہ دیکھ پاتے۔ وہ حجرے سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ ان کی بہ ظاہر غذا صرف ایک لوٹا دودھ تھی جو ہر صبح ایک دودھ والا دروازہ پر دستک دے کر رکھ جایا کرتا۔

یہ سلسلہ برسوں سے چلا آرہا تھا کہ ایک روز دودھ والا چیختا چلاتا گاؤں میں پہنچا۔

”گاؤں والو! غضب ہو گیا، میر سرور بابا کو کسی نے قتل کر دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دروازہ کھلا تھا اور ان کے جسم کے کئی ٹکڑے ہوئے پڑے تھے۔“

گاؤں میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ لوگ لاٹھی اور بھالے لے کر وہاں پہنچے تو دیکھا واقعی میر سرور صاحبؒ کا انتقال ہو چکا ہے، مگر دودھ والا حیرت کے مارے بے ہوش ہو گیا کہ ان کا جسم صحیح سلامت تھا صرف روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے دودھ والے نے جو کچھ دیکھا تھا اس پر کسی کو یقین نہیں آرہا تھ۔ گاؤں کے ان پڑھ اور

سیدھے سادے لوگ کیا جانیں کہ اللہ تعالیٰ کے عاشقوں کا یہ ایک درجہ ہوتا ہے۔ اسی حجرے میں ان کی تدفین کر دی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک جس نے بھی بارش وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لئے مزار پر چھت ڈالنے کی کوشش کی ناکام رہا۔ اگلے روز مضبوط سے مضبوط چھت گر جایا کرتی۔ آسمان اور صاحبِ مزار کے درمیان جانے کیا رابطہ تھا کہ چار انچ کی چھت بھی گوارا نہ تھی۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی۔ کھانا پکانے کے لئے گھر میں لکڑی کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔ گاؤں میں لکڑی کی دکانیں نہیں ہوتیں۔ باغوں یا جنگلوں سے لکڑی کٹوا کر سال سال بھر کے لئے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ لکڑی کی تلاش میں میرے ماموں نکلے تو دیکھا میر سرور صاحبؒ کے مزار کے پاس جو پرانا نیم کا درخت ہے وہ بہت دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کی موٹی موٹی شاخیں مزار سے دور تک سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ماموں دو موٹی ڈالیں کٹوا کر گھر لے آئے جسے سکھا کر چار پانچ دن بعد چیرا گیا اور جب اس کی پہلی لکڑی چولہے میں ڈالی گئی تو سب دنگ رہ گئے۔ اس میں سے جو دھواں نکل رہا تھا اس کی ایسی خوشبو تھی جیسی چمیلی کے پھولوں کی ہوتی ہے۔ خوف کے مارے لکڑی فوراً بجھا دی گئی۔ اس دن کے بعد سے وہ لکڑی پھر کبھی نہیں جلائی گئی۔

جس دن یہ واقعہ ہوا اسی رات میرے ماموں کو خواب میں میر سرور صاحبؒ کی زیارت ہوئی۔ ماموں نے دیکھا کہ میر سرور صاحبؒ نیم کے درخت کی اسی شاخ سے ایک ٹہنی توڑ کر اس سے مسواک کرتے ہوئے ماموں سے مخاطب ہوئے۔

"تم لوگوں نے مجھے بے آرام کر دیا۔" ماموں جب بیدار ہوئے تو بہت پریشان اور پشیمان تھے۔ اسی روز ماموں نے نیم کے تقریباً پچیس درخت منگوا کر صاحبِ مزار کے ارد گرد لگوا دیئے۔ اسی روز ان کے مزار کی چہار دیواری بنوا کر چھت ڈلوا دی۔ ایک دروازہ بھی لگوا دیا تاکہ جو جانور وغیرہ اندر اکثر چلے جاتے ہیں ان سے محفوظ ہو جائے۔ مگر اگلی صبح جب دیکھا تو باؤنڈری سمیت چھت گر چکی تھی۔ اسی رات ماموں کو بشارت بھی ہوئی کہ۔

"تم لوگ مجھے قید کرنا چاہتے ہو؟"

بہر حال اس کے بعد سے گاؤں کے کسی شخص نے چھت ڈلوانے کی جرأت نہ کی۔ آج بھی مزار پاک بغیر چھت کا ہے۔ نیم کے درختوں کا البتہ بھرپور سایہ ہے۔ آج بھیؒ گرد و نواح کے لوگ میر سرور باباؒ کے مزار سے فیض اٹھارہے ہیں۔

گاؤں میں رہ کر زندگی کا احساس ہوتا ہے جیسے جیسے لوگوں کو پتہ چلا لوگ مجھ سے ملنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ ان میں اپنے بھی تھے اور غیر بھی، ہندو بھی مسلمان بھی، ایسا لگتا محبتوں کے گھیرے میں آ گئی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں سر پر تیل کی مالش کرتی ہیں۔ بھابھیاں ہاتھ پاؤں دباتی ہیں۔ کوئی گنے کا رس نکال کر لارہا ہے تو کوئی بھٹی پر سے گرم گرم تازہ کھویا لا کر کھلا رہا ہے۔ محبت کے مارے بچے اسکول کا ناغہ کر کر کے میرے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہ سب اچھا لگا اور میں محبت کے ان تمام چہروں کا احترام کرتی ہوں جو تصنع سے عاری ہیں، جن میں کوئی بناوٹ نہیں۔ اپنائیت صرف اپنے عزیزوں سے ہی نہیں ملتی۔ یہاں تو ہر مذہب کے لوگ آپس میں پیار بانٹتے ہیں۔ گاؤں کا ایک غریب مزدور بھی محبت کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کی محبت امیر غریب، یا ذات پات نہیں دیکھتی، یہ سچ ہے کہ گاؤں کے ان پڑھ اور معمولی لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ محبت کا اپنا ایک الگ مذہب ہوتا ہے جو تمام مذاہب پر حاوی ہے، جس کی مثال ہمارے گاؤں کی ایک ہندو عورت ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ جب میں شیر خوار تھی کوئی پانچ چھ مہینے کی۔ نانا اکثر مجھے میرے والدین کے گھر سے ننھیال سنبھولی لایا کرتے تھے۔ بھتری گاؤں سے میرے ننھیال کا فاصلہ دو کوس کا ہے۔ اسی روز واپسی مشکل ہوتی کیوں کہ سواری کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ کبھی کبھی میں مستقل دو دو تین تین روز بغیر ماں کے ننھیال میں رہ جاتی۔ اس زمانے میں پاؤڈر کے دودھ کا رواج نہ تھا۔ لہٰذا میری ایک رشتے کی ممانی ہیں وہ مجھے دودھ پلایا کرتیں۔ ان کی گود میں بھی میری ہم عمر ایک بچی تھی فاطمہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ میری وجہ سے ان کی بچی بھوکی رہ جاتی۔ اس وقت ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ انہیں حالات میں ایک ہندو عورت نے جس کی گود میں بھی سورستی نام کی ایک پیاری سی بچی تھی مجھے دودھ پلایا۔ وہ کہیں بھی کھیتوں میں کام کر رہی ہوتی جیسے ہی میری بھوک کا وقت اسے یاد آتا فوراً بھاگی ہوئی ہمارے گھر

آتی۔ گھر کے کسی کونے میں فرش پر بیٹھ کر مجھے اپنے آنچل سے ڈھک لیتی، اور میں شکم سیر ہو جاتی تو وہ میرے رخسار کو چوم کر اپنے کام پر واپس چلی جاتی۔ وہ غریب تھی مگر اس عنایت کی کوئی اجرت نہ لیتی تھی۔

وہ قوم کی پاسی تھی۔ جسے ہم نیچ یا کمین کہتے ہیں، مگر اس کی چھاتی سے جو دودھ مجھ تک پہنچ رہا تھا اس کا رنگ، اس کی مٹھاس، اس کی غذائیت میری ماں کے دودھ سے الگ نہ تھی۔ اس کی چھاتی پر کہیں بھی مذہب کے فلسفے درج نہیں تھے۔

دو سال کی عمر تک میں نے مائی کا دودھ پیا اور خوب پیا۔ میری وجہ سے اس کی اپنی بچی اکثر بھوکی رہ جایا کرتی تھی۔

میں جب سن شعور کو پہنچی تو بارہا محسوس کیا کہ مائی مجھے بہت چاہتی ہے۔ میں بھی اس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ اس طبقہ کے لوگوں کو ہمارے گھرانے میں برابر میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ کرسی پر نہ پلنگ پر۔ مائی آتی تو فرش پر بیٹھتی، اس وقت مجھے کرسی یا پلنگ پر اپنا بیٹھنا برا لگتا۔ آخر کو وہ میری ماں کی جگہ تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتی اور کبھی کبھی نانی سے اجازت لے کر اسے چھوٹی سی پیڑھی دے دیا کرتی۔ وہ مجھے بہت دعائیں دیتی۔ میں اس کے سر میں اکثر تیل کی مالش بھی کر دیا کرتی تھی۔ مگر یہ سب کچھ گھر کے بزرگوں سے نظر بچا کر۔!

مجھے یاد ہے میری شادی ہو چکی تھی۔ میں بمبئی جانے لگی تو وہ بہت روئی تھی، اور مجھ سے میری ایک تصویر لی تھی۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ مائی اکثر میری تصویر دیکھ دیکھ روتی ہے۔ میری رضاعی بہن سورستی بھی پرائی ہو چکی تھی، مگر مائی اس کی طرف سے بہت دکھی تھی، کیوں کہ اس کے سسرال والے اس پر بہت ظلم کرتے تھے۔ ایک روز وہ اپنی زندگی سے اس قدر تنگ آ گئی کہ تیز رفتار ٹرین کے نیچے آ کر اپنی جان دے دی۔ سورستی کی موت نے مائی کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں آخری دم تک کے لئے چھین لیں۔ یوں تو اس کے اور بھی کئی بیٹے، بیٹیاں تھیں، مگر محبت میں جس کا خانہ ہوا اسی سے پُر ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی زندگی بھر اس کی کو پورا نہیں کر سکتا۔

مائی نے مجھے میری عمر کے جس حصے میں بھی دیکھا میرے اندر ہمیشہ اپنی سورستی کو تلاش کیا، اور یہی کہا کہ۔ "آج وہ بھی تمہارے جتنی ہوتی۔"

میں سمجھاتی۔ "مائی! یہ صرف تیری ہی نہیں ہر عورت کی کہانی ہے۔ آنچل میں دودھ اور آنکھ میں پانی ہی عورت کا مقدر ہے۔" اب مائی کو کون بتاتا کہ اس کے دودھ کی تاثیر ہی کچھ ایسی تھی کہ پینے والی دونوں بیٹیوں کا خون شہادت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ایک جلدی رہائی پا گئی اور دوسری بابِ مقتل پہ کھڑی جانے کب سے انتظار میں ہے۔!

اب کے سفر میں کئی بھولی بسری یادوں نے دامن پکڑ لیا۔

جب میں نے اس کھنڈر کو دیکھا جو کسی وقت میں ایک خوبصورت مکان تھا اس میں رہنے والے میرے رشتے کے ماموں اور خالہ جو کمسنی میں بیوہ ہو گئی تھیں شدت سے یاد آئے۔ ماموں کا نام ابوالخیر تھا۔ پڑھے لکھے اور ملازمت پیشہ تھے۔ بنارس میں بجلی کے محکمہ میں کلرک تھے۔ ان کے ساتھ ایک المیہ یہ تھا کہ خاندان میں ان سے سبھی نفرت کرتے تھے بلکہ وہ حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی پینتیس سالہ زندگی میں سات شادیاں کر چکے تھے۔ کوئی بیوی سال چھ مہینے سے زیادہ نہ ٹھہرتی تھی۔ انتہائی شکی مزاج تھے۔ بیوی پر ظلم کرتے۔ آفس جاتے تو بیوی کو کمرے میں بند کر کے تالا لگا جاتے۔ واپس آنے پر چھت سے لے کر آنگن تک مردانہ قدموں کے نشان ڈھونڈتے۔ ایسا تو نہیں کہ پائپ کے سہارے پچھلی دیوار سے کوئی اندر آیا ہو۔ کبھی کبھی غلط فہمی بھی ہو جاتی، اس وقت جب بلی وغیرہ کے پنجوں کے نشان کہیں پڑے ملتے۔ اگلے روز بیوی طلاق کے ساتھ میکے بھیج دی جاتی۔ اس طرح سات عدد بیویاں طلاق پا چکی تھیں۔

مجھے یاد ہے۔ اس روز ان کا آٹھواں نکاح تھا۔ سب لرز رہے تھے کہ یہ بے چاری بھی برباد ہوئی۔ کسی نے طنزاً کہا تھا۔ "آٹھویں بیوی کا نام نعمت ہے"۔

جیسے اس کے نام کا سہارا لے کر قسمت نے وارننگ دی ہو کہ یہ آخری موقعہ ہے۔

اور بالکل ایسا ہی ہوا، ابوالخیر ماموں نے اس نعمت کی بہت قدر کی، اور ایک وفادار

شوہر ثابت ہوئے۔ نعمت نے اس گھر کو نعمت کدے میں تبدیل کر دیا۔ آج وہ جوان بیٹے اور بیٹیوں والے ہیں۔ خوش اور آسودہ ہیں۔ دلوں کو بدلنے کا کام تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ ہم تو خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔

ارشدی خالہ میری والدہ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ جن سے اس بار ایک زمانے کے بعد ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ جوان تھیں اور میں بچی۔ جسے دیکھو لگتا ہے اپنے اندر ایک طویل کہانی سمیٹے ہوئے ہے۔ ارشدی خالہ کی پہلی شادی ابوالخیر ماموں سے ہوئی تھی۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے طلاق ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کا نکاح الہ آباد کے ایک اختیار نامی شخص سے ہوا۔ جس کی بیوی دو بچے چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ایک لڑکا تین سال کا دوسرا اس سے چھوٹا۔ ارشدی خالہ نے بچوں کو اتنا پیار دیا ایسی تربیت دی کہ لوگ آفریں کہتے تھے۔ ان کے اندر ممتا کی پیاسی عورت نے سوتیلے لفظ کو دھندلا اور بے معنی کر دیا۔ ماں سے بچوں کی محبت کا یہ عالم کہ اگر وہ الہ آباد سے دو روز کے لئے بھی گاؤں آ جاتیں تو بچے ان کے ساتھ ہوتے۔ وہ باپ سے دور رہ سکتے تھے لیکن ماں سے نہیں۔

وہ وقت بھی آیا کہ بچے جوان ہو گئے۔ ایک کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ارشدی خالہ اور ان کے شوہر میں کسی بات پر معاملہ اتنا بڑھا کہ دونوں میں مستقل علیحدگی ہو گئی۔ اس وقت بیٹوں نے بیوی سمیت ماں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ باپ اکیلا رہ گیا۔

اس واقعہ کو دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ معاشرے میں سگے اور سوتیلے رشتوں کا جو تصور قائم ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے۔ خون کا رشتہ اپنی جگہ مگر دل کے رشتے اکثر بازی لے جاتے ہیں۔

ارشدی خالہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کا خوبصورت کردار سوتیلی ماؤں کے لئے آج بھی مشعل راہ ہے۔!

مریم خالہ سے بھی بچپن کے بعد اب ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی میری رشتہ کی خالہ تھیں۔ گوری چٹی، نیلی آنکھیں، سنہرے بال، بالکل یورپین لگتی تھیں، چوڑی دار

پاجامہ اور ململ کا دوپٹہ جس کا آنچل کبھی سر سے ڈھلتے نہیں دیکھا۔ آنکھیں جو بغیر کاجل کے کجراری تھیں، اور ان میں حیا کی وہ جھلک جو واقعی مریم صفت ہونے کا ثبوت پیش کرتی تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ اس وقت شوہر کی پہلی اور آخری نشانی ان کی کوکھ میں تھی۔ میاں کی امانت ایک خوبصورت بچی کے روپ میں ملی، اور اسی بچی کے سہارے اس سولہ سال کی کمسن ماں نے پوری زندگی بیوگی میں گزار دی۔ اس زمانے میں عورت چاہے کسی بھی عمر میں بیوہ ہو اس کی شادی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

مریم خالہ دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف تھیں۔ انتہائی سادہ لوح اور بھولی تھیں۔ ایک بار کا واقعہ یاد ہے، وہ جب اپنی بچی کے گھر سے اپنے میکے یعنی سہولی آئی تھیں تو اس وقت ہمارے گاؤں میں بسیں چلنے لگی تھیں۔ وہ دروازہ پر کھڑی تھیں کہ بہت دور سڑک پر سے کوئی بس جاتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ گھبرا گئیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ وہ بے تحاشہ بھاگی ہوئی گھر میں آئیں اور میری نانی سے بولیں۔

"آپ نے دیکھا نہیں باہر سڑک پر صندوق بھاگا جا رہا ہے۔"

ان کی بات پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ پھر انہیں بس کا سارا سسٹم سمجھایا گیا۔ پھر بھی وہ نہ سمجھیں۔ انہوں نے تو آج تک سواری کے لئے صرف بیل گاڑی، تانگے، اور ڈولی ہی دیکھی تھی۔ جو کبھی اتنی تیزی سے بھاگتی نہ تھی۔ بوڑھی ہو گئی تھیں مگر آسمان پر پرواز کرتے ہوئے جہاز کو ہمیشہ کوئی بڑا پرندہ ہی سمجھتی رہیں۔ کتنی راحت تھی اس نہ سمجھنے میں۔ جب ہی تو ہر لمحہ بات بات پر مسکراتی رہتی تھیں۔

ہم تھوڑا سا جان گئے ہیں اس لئے اداس رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے ہمارا ادراک ہی ہمارے لیے کرب بن جاتا ہے۔

اب مریم خالہ بھی دوسرے جہاں میں پہنچ چکی ہیں۔ اللہ جانے ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہو گا؟ مگر اکثر میں سوچتی ہوں، مریم خالہ نے یقیناً بڑی سادگی سے کہہ دیا ہو گا۔

باری تعالیٰ! مجھے تو کچھ علم ہی نہ تھا!

اس روز موسم بڑا خوشگوار تھا۔ بچپن کی سہیلیاں بھی ملنے آئی ہوئی تھیں۔

پروگرام بنا کہ کھیتوں کی سیر کی جائے۔ چوں کہ ہمارے یہاں سخت پردے کا رواج تھا، مگر نانا اور ماموں کے انتقال کے بعد کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ہم سب نکل پڑے۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ یہ سرسوں پھولنے کی رت ہوتی ہے۔ دور دور تک کھیتوں میں ایسا لگتا تھا زرد رنگ کی خوبصورت مخملیں چادر بچھادی گئی ہو۔ اس کے علاوہ مٹر کے کھیتوں میں بھی جیسے بہار سفید گلابی اور فالسئی پھولوں کی شکل میں جھوم رہی ہو۔ آگے بڑھے تو گنے کے کھیت تھے۔ آسمان پر ہلکا ابر تھا۔ ہوا سرد اور پر کیف تھی۔ ہم پگڈنڈی کے ایک طرف مہوے کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اس وقت مجھے اپنا بچپن اتنی شدت سے یاد آیا کہ میں رو پڑی۔ یادوں کے دریچے جب کھلتے ہیں تو جانے کیا کیا یاد آتا ہے۔ کتنی پرچھائیں وجود کو چھو کر گزر گئیں۔ کتنی آہٹیں خوابیدہ لمحوں کو بیدار کر گئیں۔ طبیعت نڈھال سی ہو گئی۔ محسوس ہوا مجھے تیز بخار ہے۔ ہم واپسی کے لئے فوراً چل پڑے۔ میرے ساتھ جو لوگ تھے کسی کے ہاتھ میں گنا تھا، کسی کے ہاتھ میں مٹر کی پھلی، مگر میں اپنے آنچل میں صرف اپنا بچپن لیے ہوئے گھر تک آگئی۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ہم خواب نہیں دیکھتے، انتظار بھی نہیں کرتے، مگر وہ اکثر دبے پاؤں دل میں چلے آتے ہیں۔ آج ایک ایسی ہی آہٹ کا مجھے احساس ہوا تھا۔

میں آنگن میں لیٹی ہوئی نیم کے اس پرانے درخت کو دیکھ رہی تھی جس پر برسات کے مہینوں میں ہم جھولا جھولتے تھے۔ درخت کی جانے کس شاخ سے ایک لمحہ خوابیدہ سا، خاموش سا پھسل کر میری آنکھوں میں اتر گیا، اس دن بھی ہم اپنی کمسنی کو جھولے کی گود میں ڈالے اپنے آپ سے بے خبر تھے کہ سامنے سے ایک پرندہ گزرا۔ پہلی بار دیکھا تھا۔ شرم سے نظریں نیچی کر لیں۔ وہ بھی شرمیلا تھا۔ آگے بڑھ گیا، وہ اڑنا جانتا تھا اور میں پرواز کے لئے پنکھ نہیں رکھتی تھی۔ اگلے روز دوبارہ اسے خاندان کی ایک تقریب میں دیکھا۔ لوگوں نے بتایا وہ میرا قریبی رشتہ دار ہے، مگر اس روز بہت خاموش اور اداس نظر آرہا تھا۔

دو سال بعد۔ پھر وہ شہر سے گاؤں آیا۔ اب کے ساتھ اس کی ماں بھی تھیں۔ ان دو سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ نیم کے درخت سے جھولے کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ اور اب اس شاخ پر صرف کوئل بیٹھی آہ و نالہ میں مصروف رہتی۔!

اس دن جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ چونک گیا تھا کیوں کہ میرے ماتھے پر ایک ننھی سی بندیا چمک رہی تھی۔ یہ اس بات کی غماز تھی کہ میری شادی ہو چکی ہے، اسے قطعی علم نہ تھا، شادی عجلت میں اور سادگی سے انجام پائی تھی، اسی وجہ سے قریب اور دور کے سبھی رشتہ دار شرکت سے محروم رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی ماں سے تصدیق کی اور پھر جانے کتنے اذیت ناک مراحل طے کر کے یہ جملہ کہا تھا۔

"امی میں تو آپ سے کہنے والا تھا کہ نفیس کو میرے لیے مانگ لیں۔" اس کے بعد اس کے منہ سے دوسرا کوئی لفظ نہ نکلا۔ ہاں دوسرے دن دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

بہت دنوں تک اس کے خوابوں کا ٹوٹا ہوا جزیرہ ویران پڑا رہا۔ پھر ایک نئی بہار نے آکر اسے آباد کر لیا.........!!

جلتے رہنا اس کا مقدر

جب بھی کسی عورت کے اندر جھانک کر دیکھا وہ دکھی ہی نظر آئی۔ چاہے وہ شہر کی ہو، یا دیہات کی۔ نصیب سب کا ایک سا لگتا ہے ......

نہیں ہوتیں کبھی ساحل کے ارمانوں سے وابستہ
ہماری کشتیاں رہتی ہیں طوفانوں سے وابستہ

مہ جبین کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا بائیس سال کی یہ بھولی بھالی لڑکی قدرت کے کیسے کیسے امتحانات سے گزر رہی تھی۔ وہ ہمارے قریبی گاؤں کی لڑکی تھی۔ دو سال پہلے بیاہ کر آئی تھی۔ چھ ماہ کی حاملہ تھی کہ ایک روز خاوند یہ کہہ کر گیا کہ۔

"میں بنارس جا رہا ہوں۔ شام تک واپس آ جاؤں گا۔" مگر وہ شام کبھی نہ آئی۔ جب انتظار ختم ہوتا، آنکھیں پتھرا گئیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود خاوند کا سراغ نہ ملا۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ سارا گاؤں حیرت زدہ تھا۔ مگر یہ راز تو میرے خالو اور خالہ ہی جانتے تھے کہ منا کہاں جا سکتا ہے یا وہ کن حادثوں کا شکار ہو سکتا ہے؟

یہ 1981 یا 1982 کی بات ہے جب خالو گورکھپور جیل کے محکمہ میں پوسٹیڈ تھے۔ انہیں دنوں جیل میں ایک قیدی آیا جس کی عمر 23 سال، دیکھنے میں بے حد معصوم صورت، اور نیک لگتا تھا۔ وہ بہار کے ایک ٹھاکر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر میں وہ ایک جرائم پیشہ گروہ میں پھنس گیا، جن کا کام ٹرین ڈکیتی تھا۔ اس کی کیس فائل کو دیکھ کر خالو

کو بہت افسوس ہوا۔ کیوں کہ وہ لڑکا طبیعتاً نیک معلوم ہوتا تھا۔ خالو نے اپنے طور پر اسے سمجھایا کہ یہ مجرمانہ روش ترک کر دے اور اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آئے۔ وہ خالو کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اب کے جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ اپنے اس پیشے سے بھی آزاد ہو جائے گا۔ اس نے کہا اب وہ پلٹ کر اپنے گھر نہیں جائے گا۔ بلکہ کسی غیر جگہ پر رہ کر نئی زندگی شروع کرے گا۔ بہر حال جب اس کی سزا پوری ہو گئی تو خالو اسے اپنے گاؤں لے آئے۔ گاؤں والے اور اہل خاندان صرف یہی جانتے تھے کہ اس کا نام منا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اسی لئے خالو نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ وہ خالو کی بہت عزت کرتا تھا۔ بہت کم عرصے میں وہ گھر والوں سے مانوس ہو گیا۔ اس طرح گھل مل گیا جیسے اس گھر کا کوئی فرد ہو۔ خالہ جان اور خالو کے علاوہ کسی کو بھی یہ علم نہ تھا کہ وہ ہندو ہے۔ اس نے گاؤں میں آٹے کی چکی لگوا لی اور دوسرے تیسرے مہینے دلّی سے کچھ کپڑے وغیرہ لا کر گاؤں میں فروخت کرتا تھا۔ جب وہ مکمل طور پر سیٹل ہو گیا تو یہ خواہش ظاہر کی کہ مسلمان ہونا چاہتا ہے۔ وہ دلّی آیا اور فتح پوری کے ایک مولانا کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا، اور ضد کرنے لگا کہ میری ختنہ بھی کرا دیں مگر مولانا نے سمجھایا کہ مسلمان ہونے کے لئے ختنہ شرط نہیں۔ اس عمر میں خود کو اذیت دینے سے کیا فائدہ۔

وہ گاؤں واپس آ گیا۔ اب دوسری خواہش شادی کی تھی۔ لہٰذا جن کا حسب نسب معلوم نہ ہو ان کو خاندانی رشتہ نہیں ملتا۔ مگر اس معاملے میں منا کا نصیب اچھا تھا ایک لڑکی جو یتیم اور بے سہارا تھی مگر اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ منا کی شریک حیات بن گئی۔ میاں بیوی میں محبت بھی تھی اور ذہنی ہم آہنگی بھی۔ زندگی مزے میں گزر رہی تھی مگر اچانک نہ جانے کیا ہو گیا۔ شادی کے دو سال بعد منا کا لاپتہ ہو جانا دوسروں کے لئے معمہ تو ہو سکتا ہے مگر خالو معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ پہلے تو وہ بھی ذہن کو الجھا رہے تھے مگر ایک روز گاؤں کے صراف نے خالو کو چپکے سے یہ بتایا تھا کہ غائب ہونے والی آخری رات میں منا اس کے پاس گیا تھا اور کہا تھا۔

”مجھے ایک رات میں دس بارہ کلو سونے کا زیور چاہیے۔ سونا میرے پاس ہے“۔

صرف نے کسی انجانے خوف کے تحت انکار کر دیا تھا اور پھر خالو کے پولیس والے دوست نے اس رات کی گرفتاری کو بنارس کے "وشوناتھ مندر" کے اس واقعہ سے جوڑا تھا جو اسی رات پیش آیا تھا۔ مندر کی ایک قدیم سونے کی مورتی چوری ہو گئی تھی۔ خالو کو شدید ذہنی جھٹکا تھا جب ان حالات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ مہتاب بھی جرم کی دنیا میں رہ رہا تھا۔ اور اس کا ظاہر صرف دکھاوا تھا اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک پناہ گاہ ڈھونڈی تھی، مگر یہ نہ سوچا کہ اس گھناؤنے کھیل نے ایک عورت کو برباد کر دیا۔

مہ جبین اب ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔ وہ مستقل خالہ جان کی سرپرستی میں رہتی تھی۔

وقت گزرتا رہا، پانچ سال تک وہ ہر آہٹ پر چونک کر دروازہ کھولتی رہی کہ شاید اس کا خاوند واپس آ گیا ہو۔ مگر جو واپسی کے ارادے سے ہی نہ گیا ہو اس کا انتظار کہاں ختم ہوتا ہے۔؟

ہاں، ایک فیصلہ ضرور ہو گیا۔ خالو نے مفتی سے مسئلہ معلوم کر کے مہ جبین کا دوسرا نکاح کر دیا اور اب وہ کئی بچوں کی ماں ہے۔ وہ من کو بھلا پائی یا نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے مگر یہ سچ ہے کہ پہلے خواب کی دستک آخری دم تک گونجتی ہے۔!

اسلام جس کا ذکر خود نوشت کے شروع میں کر چکی ہوں کہ میرے ماموں کو ایک بھٹکا ہوا بچہ ملا تھا، انہوں نے اسے گود لے لیا تھا۔ پرورش اور پھر اب شادی بیاہ کی تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ 23 سال پرانا واقعہ اب یادداشت میں دھندلا پڑ گیا تھا۔ ایک روز اچانک ہی حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ میری خالہ گورکھپور سے آئیں تو بتایا کہ وہاں جو ان کی پڑوسن ہیں ایک دن باتوں باتوں میں اپنے بچے کے گم ہونے کا ذکر چھیڑ دیا۔ بچپن کا فوٹو بھی دکھایا جو سو فیصدی اسلام کا ہی تھا۔ خالہ جان کو اسلام کا پورا بچپن یاد تھا۔ جب وہ اس گھر میں آیا تھا تو خالہ جان بائیس سال کی تھیں۔ پورے یقین سے کہہ رہی تھیں کہ یہ وہی بچہ ہے۔ یہ تمام حالات جان کر ماموں نے اسلام کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا۔ ماں نے جب سنا تو تڑپ کر ہمارے گاؤں پہنچیں۔

مجھے یاد ہے۔ وہ منظر بھی عجیب منظر تھا۔ جب اسلام کی ماں اور دوسرے عزیز گورکھپور سے آئے ہوئے تھے۔ خاندان کی کچھ بزرگ خواتین سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اسلام گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت تک اسے اس انکشاف کا قطعی علم نہ تھا۔ وہ کاروباری سلسلے میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔ جیسے ہی آنگن میں قدم رکھا سامنے بیٹھی ہوئی سفید ساڑی میں ایک سن رسیدہ خاتون کو دیکھ کر بے ساختہ بول پڑا۔

"امی"؟

پھر کیا تھا۔ طوفان کنارا توڑ کر بہہ نکلا۔ ماں بیٹے کے ملن کا جو منظر تھا وہ دل کو ہلا دینے والا تھا۔ ہر آنکھ برس پڑی۔ وہ بے تحاشہ بیٹے کو چوم رہی تھیں اور اسلام ماں کے کندھے پر گر کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"بیٹے! تیرے ابو تیرا غم لے کر دنیا سے چل بسے۔ میرے لال اب تو مل گیا ہے تو میں ایک منٹ کے لئے بھی تجھ سے الگ نہیں رہ سکتی۔ چل جلدی سے سامان باندھ لے۔ تیرا گھر برسوں سے تیری راہ دیکھ رہا ہے"۔

وہ بلا توقف بولے جا رہی تھیں مگر اسلام نے آنسو پونچھ کر نہایت فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔

"امی، جب میں آپ سے بچھڑا تھا تو چار سال کا تھا، مگر آج تک آپ مجھے بھول نہیں سکیں۔ اب آپ میرے ان والدین سے دور کرنا چاہتی ہیں جنہوں نے مجھے 23 سال سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ میں ہرگز نہیں جا سکتا۔ آپ کو میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

مگر ماں نے ساتھ رہنے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ ان کا دوسرا بیٹا اور اس کا خاندان بھی تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ دیتیں۔ وہ اس وقت تو واپس چلی گئیں۔ مگر بعد میں وہ اکثر اپنے بیٹے سے ملنے آیا کرتیں اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

میرے ماموں اور ممانی اب اس جہان میں نہیں ہیں۔ اسلام چاہتا تو اپنے والدین کی طرف لوٹ سکتا تھا مگر اسے تو اپنے آبائی وطن سے زیادہ اس سرزمین کی مٹی عزیز ہے جہاں اس پر محبت نثار کرنے والی دو ہستیاں مدفون ہیں۔!

پرچھائیاں ابھرتی رہیں

گاؤں آئے ہوئے مجھے تقریباً ایک ماہ ہو گیا تھا۔ عزیزوں، دوستوں، پڑوسیوں، بھولے بسرے سب سے مل رہی تھی مگر جانے کیوں مجھے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا ابھی کسی ایسی ہستی سے ملنا باقی ہے جس کے بغیر یہ داستان ادھوری ہے۔ دراصل گاؤں میں رہ کر میں اپنے گاؤں کو ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ تشنگی اس لیے تھی کہ دس سالوں میں سنبھولی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ شہر کے جراثیم اب دھیرے دھیرے وہاں بھی پہنچ رہے تھے۔ آنگن کے طاق اب چراغوں سے خالی تھے۔ ان کی جگہ اب برقی بلب جلنے لگے تھے۔ کنواں بے چارہ بھی اب تنہا ہو گیا تھا۔ صبح و شام مٹکہ بالٹی، گگری لیے ہوئے جو پانی بھرنے والیاں جگت پر اکٹھا ہوا کرتی تھیں انہوں نے واٹر سپلائی کے نلوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اب ہر گھر میں نل تھا۔ کنواں جب پیاسے کے پاس خود آجائے تو کیا ضرورت ہے اتنی مشقت اٹھانے کی۔

جب سے گاؤں میں اناج پیسنے کی مشین آئی تھی، آٹا چکی پر سے ہی آتا تھا۔ وہ رونقیں بھی ختم ہو گئی تھیں جب مزدوری پر گاؤں کی غریب عورتیں دن دن بھر چکی میں گیہوں، جو، چنے اور باجرہ پیستی تھیں اور اس وقت اپنے مخصوص لوک گیت گایا کرتی تھیں۔ اس طرح ان کے کام میں آسانی ہوتی تھی اور سننے والے لطف لیتے تھے۔ سواری کے لیے اب رکشہ اور بس وغیرہ کی سہولیات ہیں مگر وہ لطف کچھ اور ہی تھا جب خواتین کے لیے چار کہار ڈولی لے کر آجاتے۔ ڈولی گھر کے صدر دروازے پر رکھ کر رخ پھیر کر دوسری طرف

کھڑے ہو جاتے جب برقعہ یا چادر میں لپٹی ہوئی خواتین اندر بیٹھ جاتیں تو انہیں ڈولی اٹھانے کا سگنل ملتا۔ گرد و غبار والی کچی سڑکیں بھی سیاہ تارکول کا لباس پہن چکی تھیں۔ نہ اب وہ سڑکیں تھیں نہ ان پر چلنے والی بیل گاڑیاں کہ جب گزرتیں تو گاؤں کے شریر بچے ان کے پیچھے بے تحاشہ بھاگتے ہوئے نظر آتے۔ بیل گاڑی گزر جاتی، غبار رہ جاتا مگر اب وہ سارا منظر کھو گیا تھا۔ اب بچے بھی سنجیدہ اور سمجھدار ہو گئے تھے۔ موٹر گاڑی دور سے دیکھ کر ایک طرف کو ہو جاتے ہیں۔

کھپریل کے کچے مکانات بھی اب بہت کم دکھائی دیتے۔ گھر کے پاس کا وہ گہرا تالاب جس میں کنول کے پھول اور سنگھاڑے کی بیلیں جا بجا، پانی کی سطح پر بچھی ہوتی تھیں اور جس کے کنارے پر سفید بگلے، سارس اور طرح طرح کے خوشنما پرندے اترتے تھے اب وہ تمام رونقیں ایک کھیت میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کسانوں کے وہ غریب بچے جو ننگے بدن اور ننگے پیر کھیتوں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ کام کرتے تھے اب وہ پڑھ لکھ کر اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ تعلیم کے حصول کے بعد سادگی اور بھولپن یوں بھی کم ہو جاتا ہے۔

جانے کیوں، میں ہر وقت ہر کسی میں وہ زمانہ ڈھونڈتی جس میں پروان چڑھی تھی۔ اب صرف چند لوگوں میں اس زمانے کا عکس باقی تھا، اور یہ لوگ میرے لیے آج بھی قابل احترام ہیں۔ ان کی بے لوثیت پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے کہ کسی قریبی گاؤں کی ایک ہندو لڑکی نے اپنی پسند کے لڑکے سے جو اس کی ذات کا نہ تھا کورٹ میرج کرلی۔ اس بات کو لے کر ایک ہنگامہ برپا ہو اٹھا تھا۔ برسوں اس کے گھر والوں کا برادری میں حقہ پانی بند رہا —— گاؤں کی کچھ تبدیلیاں اکھرتی ہیں تو کچھ قابل تحسین بھی ہیں۔ اب غیر قوم کے لڑکے یا لڑکی سے شادی، عام رواج بن گیا ہے۔ اب اس بات پر کوئی ہنگامہ یا شور نہیں ہوتا۔ کسی کو سماج سے کاٹا نہیں جاتا۔ کسی کو گاؤں نکالا نہیں ملتا۔ اب لوگوں میں Adjustment کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

یہ بات نہیں کہ پہلے کے لوگ باصلاحیت نہیں تھے۔ دراصل! سماجی روایات کو

توڑنے کے لیے اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس موضوع پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ والدہ بتاتی ہیں کہ میرے دادا کے تین بھائیوں کی مشترکہ فیملی ہمارے گھر کے سامنے رہتی تھی۔ تین بھائیوں کی کثیر اولادیں تھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک بڑے سے گھر میں چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ ان میں سے ایک چچا زاد بہن بھائی کا آپس میں معاشقہ چل رہا تھا۔ لڑکا بھی وجیہ تھا مگر بڑی احتیاط کے ساتھ عشق آگے بڑھ رہا تھا۔ گھر میں کسی کو قطعی علم نہ تھا۔ مگر عشق وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ دونوں روزانہ اپنے گھر کے احاطہ میں جو بہت وسیع تھا ملا کرتے، جہاں پر امرود، پپیتے، کیلے، بیری، انار اور مہندی سے لے کر نیم تک کے درخت موجود تھے۔

اس شام نہ جانے کیا ہوا۔ جیسے جادو پر بھی کسی نے جادو کر دیا ہو۔ فجر کا وقت ہو چکا تھا مگر وہ دونوں نیم کے سائے میں نرم گھاس پر ایک دوسرے سے بے حد قریب بے خبر سو رہے تھے۔ اسی وقت لڑکی کے والد نے مسواک کے لیے احاطے میں جیسے ہی قدم رکھا ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ٹھیک اسی وقت موذن نے اذان دی۔ میرے دادا خاموشی سے سر جھکائے باہر نکل گئے۔ مسجد کی بجائے ان کا رخ قاضی صاحب کے گھر کی جانب تھا ———

چند لمحوں میں وہ قاضی کو لے کر آگئے۔ پیار کے متوالے اب بیدار ہو چکے تھے۔ مگر بے حد پریشان کہ احاطے کے تمام دروازوں کی باہر سے کنڈی کس نے لگا دی؟ دس منٹ کے اندر ہی دو سر پشیمانی سے جھکے ہوئے تھے اور قاضی صاحب نکاح کے کلمات ادا کر رہے تھے۔

گھر کے افراد جب نیند سے بیدار ہوئے تو دادا نے سب کو یہ اطلاع دی اور کہا کہ۔

"میں اپنے خاندان میں ایک ایسی شادی بھی چاہتا تھا جو سب کو چونکا دے۔ حیرت زدہ کر دے اور برسوں تک لوگ اسے یاد رکھیں۔ ہے نا یہ عجیب و غریب نکاح؟"

تمام اہل خانہ محوِ حیرت تھے اور وہ دونوں جو ابھی ابھی رشتۂ ازدواج میں بندھے تھے ان کی جھکی ہوئی نظریں اس عظیم انسان کے قدموں کا طواف کر رہی تھیں جو خاندانی

وقار اور عزت کا محافظ ہی نہیں محبت کی عظمت کو پہچاننے والا بھی تھا ——— !

دہلی سے گاؤں آئے ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ جب بھی دہلی کا پروگرام بناتی کبھی خالہ زاد بہنیں، کبھی خالہ جان اور کبھی ممانی کہتیں، دو چار دن اور ٹھہر جاؤ ابھی ہمارا دل نہیں بھرا اور میں سوچتی دل کہاں بھرتا ہے؟ دل کے نصیب میں تو ہمیشہ تشنہ رہنا ہے۔

میں نے حال کو کبھی سینے سے نہیں لگایا۔ ہمیشہ ماضی میں زندہ رہی ہوں۔ آج بھی آنکھیں بند کر کے ماضی کو سمیٹ رہی تھی۔ مختلف پرچھائیاں ذہن کو چھو کر گزر رہی تھیں۔ نانا، نانی، ماموں اور وہ سارے لوگ جو محبت کے دیوتا تھے اور اب آسمان کے اس پار جا چکے تھے، شدت سے یاد آرہے تھے۔ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ میرے اندر سرایت کرتا جارہا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں بستر سے اٹھی، نائٹ بلب بجھادیا اور چپکے سے کمرے کے اس سونے طاق میں چراغ روشن کردیا جسے کبھی ہر شام میں جلایا کرتی تھی اور اب بیٹھ کر غور سے چراغ کی اس لو کو دیکھ رہی تھی جس کی جلتی پیشانی پر جانے کتنے کربناک لمحوں کی حرارت درج تھی۔ چراغ مجھے دیکھ رہا تھا اور میں چراغ کو۔ اسی وقت خالہ جان کی آنکھ کھل گئی۔

"کیا بجلی چلی گئی ہے؟"

انہوں نے طاق میں جلتے ہوئے چراغ کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"نہیں بجلی تو ہے روشنی کم تھی۔" میں نے جواب دیا اور وہ نیند کی غفلت میں کچھ نہ سمجھ سکیں، سوگئیں۔

چراغوں کا درد ہر کوئی کہاں سمجھتا ہے؟ صبح دیکھا تو طاق کی محراب میں چراغ خاموش تھا اور دھوئیں کی سیاہی میں میرا اجلا اجلا بچپن سو رہا تھا۔ میں نے اسے حسرت سے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ کس کس منظر سے نظریں چراتی۔ یادیں بکھری پڑی تھیں۔ لگتا ہر وقت شور ہے، ہنگامہ ہے، افراتفری ہے۔ کسے بھولوں کسے یاد رکھوں، کسے نظر انداز کردوں، مشکل میں جان تھی۔ باہر کا شور جتنا تیز ہوتا میرے اندر ویرانیوں اور

خاموشیوں کا ایک جال سا بنتا چلا جاتا۔ اس حصار میں جیسے قید ہو کر رہ گئی تھی۔ سب لوگ ہنستے بولتے دنیا جہان کی باتیں کرتے اور میں صرف اپنے ماضی میں کھوئی رہتی۔ سوچتی، میرے علاوہ جتنے لوگ ہیں انہیں اپنا ماضی شدت سے یاد کیوں نہیں آتا؟ یا یہ سب بے حس ہیں یا شاید میں ہی ضرورت سے زیادہ حساس ہوں، پاگل ہوں۔ میں دیکھتی لوگ اپنے بچپن کا ذکر کرتے تو میری طرح ان کے جذبوں میں شدت نہ ہوتی، تڑپ نہ ہوتی، کوئی میری طرح نہ تھا۔ کوئی میری طرح ہوتا بھی کیوں؟ سورج کے بعد ساری آگ میرے ہی حصے میں آئی تھی مگر مجھے دکھ نہیں فخر ہے، خوشی ہے۔ احترام کرتی ہوں اس آگ کا جس نے میرے باطن سے غم کے سوا تمام چیزیں جلا کر خاکستر کر دیں۔ آج اگر یہ آگ نہ ہوتی تو میرے اندر جانے کیا کیا ہوتا۔ بلکہ بہت کچھ ہوتا اور جب سب کچھ ہوتا تو میں نہ ہوتی۔ جب تک نفیس بانو تھی تو کچھ پہچانتی نہ تھی۔ شمع بن کر زمانے کی شناخت ہو گئی اور دنیا کی شناخت ہو جانا ہی انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

جو مجھ میں تجھ میں چلا آ رہا ہے صدیوں سے
کہیں حیات اسی فاصلے کا نام نہ ہو

محبتیں دامن کھینچتی رہیں اور میں آگے بڑھ گئی۔ کب تک ٹھہرتی؟ جانے والوں کو تو جانا ہی ہوتا ہے۔ گاؤں پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے سب کو خدا حافظ کہا اور سفر پر نکل پڑی۔ گاؤں کی پگڈنڈیوں پر کھڑا میرا بچپن دور تک مجھے پکارتا رہا اور میں مڑ مڑ کر جانے کب تک اسے دیکھتی رہی۔

سہولی سے بذریعہ بس تین گھنٹے کے بعد بنارس ریلوے اسٹیشن پہنچی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ دہلی کے لیے ہمیں اگلے روز صبح والی ٹرین لینی تھی۔ میرے ہمراہ والدہ بھی تھیں۔ اسٹیشن کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں صبح تک کے لیے کمرہ بک کروایا۔ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے تو چائے کی طلب ہوئی۔ والدہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر گیسٹ ہاؤس کے سامنے ایک چائے کی دکان تھی وہاں چلی گئیں، اور میں بیڈ پر دیوار کا سہارا لیے بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی کہ اچانک وہ واقعہ گزرا جسے لکھتے ہوئے آج بھی میرا رواں رواں

لرز جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے بستر پر بالکل میرے پاس مجھ سے تقریباً دو فٹ کی دوری پر سامنے ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی عمر گیارہ بارہ سال رہی ہو گی۔ وہ بالکل برہنہ تھا، آلتی پالتی مارے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی بڑی جیسے بیل کی آنکھیں، چہرا اور سر بھی غیر معمولی حد تک بہت بڑا۔ ٹانگیں اتنی موٹی جیسے ریسلنگ کے پہلوانوں کی ہوتی ہیں۔

اس عجیب وغریب انسانی شکل کو دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یہ کیا؟''

اسی وقت وہ بچہ غائب ہو گیا۔ بستر پر بیٹھا ہوا جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ میں دم بخود رہ گئی اور اس سے پہلے کہ خوف کے مارے میری چیخ نکل جاتی، میں کمرے سے باہر بھاگی اور منیجر کے آفس میں جا کر تمام واقعہ سنایا۔ تب تک والدہ چائے لے کر واپس آچکی تھیں۔ منیجر نے ہر طرح سے مجھے مطمئن کرنا چاہا۔ بولا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، آپ کو وہم ہوا ہے۔ بہر حال دس منٹ کے اندر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور کمرہ چھوڑ کر جانے لگے تو ہوٹل والوں نے دوسرا کمرہ دے دیا۔ بہر حال نئے کمرے میں بھی خوف ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے تمام بلب آن کر دیے اور والدہ سے کہا۔ آج رات ہم سوئیں گے نہیں۔

تھوڑی دیر بعد۔ ہوٹل کا ملازم پانی لے کر آیا جس کی عمر ۷۰ سال ہو گی۔ اس واقعہ کا علم اسے بھی ہو گیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی بولا۔

''میڈم! آپ گھبرائیں نہیں۔ آرام سے رہیں آپ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ صحیح ہے مگر آپ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رازداری سے کیوں کہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اس انداز سے جیسے کوئی اس کی بات سن نہ لے۔

''کیا یہاں پر پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس کمرے میں ٹھہرنے والوں کو اکثر یہ بچہ نظر آتا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''دیکھیے میڈم! منیجر کو پتہ نہ چلے۔ ہم یہاں کے نوکر ہیں۔ دو منٹ میں ہماری چھٹی ہو جائے گی۔''

میں نے اسے اطمینان دلایا پھر اس نے بتایا کہ۔

اب سے کوئی بارہ سال پہلے اسی کمرے میں ایک میاں بیوی اور ایک دس گیارہ سال کا بچہ آکر ٹھہرے تھے۔ تقریباً ہفتہ بھر سے رہ رہے تھے۔ ایک روز جب سارا دن اور ساری رات دروازہ نہیں کھلا تو ہوٹل والوں کو تجسس ہوا۔ دروازہ پر دستکوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لہٰذا پولیس کی مدد سے دروازہ کھلوا گیا تو میاں بیوی غائب تھے۔ پچھلی طرف ہوٹل کے احاطے میں جو کھڑکی کھلتی تھی، اس میں پہلے سلاخیں نہ تھیں۔ کھڑکی کے نیچے بچے کی لاش پڑی ہوئی ملی۔

مجرموں کا کوئی سراغ نہ لگا۔ آج تک پتہ نہ چل سکا کہ وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے یہ قتل کیوں کیا؟ ملازم یہ واقعہ سنا کر چلا گیا اور میں سوچ میں پڑ گئی کہ آخر وہ بچہ خود کو ظاہر کیوں کرتا ہے؟ کیا اس لیے کہ پولیس کی بند فائلوں سے نکل کر عوام میں اس کی مظلومیت کے چرچے ہوں؟——

وہ چراغ بھی بجھ گئے

ڈیڑھ ماہ کی مسافت کے بعد دہلی پہنچی تھی۔ مکان کا تالا کھولا تو لگا کسی جن خانہ میں آ گئی ہوں۔ کمرے میں جا بجا مکڑی نے جالے بن رکھے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت تھے کہ ویرانوں کو آباد کرنا ان کی فطرت ہے۔ وہ اس معاملہ میں انسانوں سے بہتر ہیں۔

لان کے خوبصورت گلاب، چمیلی، موتیا، بغیر پانی کے مرجھا مرجھا کر سوکھ گئے تھے اور وہ خشک لکڑی کے روپ میں اپنی تباہیوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ سب ہار جاتے ہیں زندگی سے، زندگی کے مصائب سے مگر میں اتنی سخت جان کیوں ہوں؟ کبھی ہارتی کیوں نہیں؟ کیوں زندگی سے لڑ رہی ہوں؟ وہ زندگی جو ایک صحرا ہے، تپتا ہوا جلتا ہوا۔ زندگی کی تمام حرارتیں رگوں میں منجمد ہو گئی ہیں، پھر بھی جی رہی ہوں۔ ایک کرشمہ کی طرح۔ ایک معجزہ بن کر، ایک کرامت کی صورت میں۔

یوں تو تنہائی پسند ہوں، مگر اس بار جب سے گاؤں سے آئی تھی۔ ہر پل جی چاہتا کہ گھر میں بہت سارے لوگ ہوں، چہل پہل ہو، رونقیں ہوں اور میں ان ہنگاموں کے بیچ گھری رہوں مصروف رہوں۔ انسان جانے کیوں ایسی آرزوئیں کرتا ہے، جو اس کے نصیب کا حصہ نہیں ہوتیں۔ کیوں کبھی کبھی مسکرانے کو بھی دل چاہتا ہے؟

ان دنوں میرے پاس ایک کتا تھا جس کا نام روور (Rover) تھا جسے چھوٹے پن سے پالا تھا۔ نہایت سمجھدار اور وفادار، جب وہ بھونکتا تو لگتا اس گھر میں ابھی زندگی کے آثار

رہتی ہیں۔ بچوں سے میری زیادہ بات نہ ہوتی تھی۔ اول تو ان کو اسکول کے کاموں سے فرصت نہ ملتی اس کے بعد وہ ٹی وی پروگرام میں مصروف ہو جاتے۔ ٹی وی وغیرہ میں میری زیادہ دلچسپی نہیں۔ کبھی کبھار کچھ اچھا لگا تو دیکھ لیا۔ اس گھر میں صرف میں اور روور تھے جن کی دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ بھی شاید اکیلا پن محسوس کرتا تھا۔ جب میں چھت پر جاتی تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ سیڑھیوں پر چڑھتا۔ جب تک چھت پر رہتی میرے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا۔ میں اس سے باتیں کرتی تو مجھے غور سے دیکھتا اور دم ہلاتا۔ میں اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی نہ وہ میری مگر جذبات کی بھی ایک زبان ہوتی ہے جو الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔ اشارے مفہوم واضح کر دیتے ہیں۔

وہ میرا ہمدرد تھا وفادار تھا انسانوں نے ساتھ چھوڑا تو جانوروں کے ذریعہ میری مسیحائی کی گئی۔

جب گھٹن زیادہ بڑھ جاتی تو اپنی تمام تر توجہ شاعری پر مرکوز کر دیتی۔ جانے کون تھا جو میرے جذبات کو لفظوں میں ڈھال رہا تھا۔

آ جائے تو تنہائی کے اس شیلف سے نکلوں
کھل جاؤں کتابوں کی طرح اور پڑھے وہ
خاکہ ہوں تو پھر مجھ کو کوئی شکل بھی بخشے
تصویر ہوں تو مجھ میں کوئی رنگ بھرے وہ

آخری شاخ بھی طوفان کی زد سے نہ بچی
زرد موسم میں بھٹکتے پھرے جگنو اب کے
تشریح اس کی کرتی رہی شمع عمر بھر
اک لفظ لکھ گیا تھا وہ دل کی کتاب میں

دھوکے سے مجھ کو کچے گھڑے پھر دیے گئے
اس بار بھی میں پار یہ دریا نہ کر سکی

درد ! مایوسی ! انتظار ! ہیجان ! سب یکجا، کس کس کو بھلاتی، کس کس سے پیچھا چھڑاتی، ایک زخم مندمل نہ ہونے پاتا کہ دوسرا لگ جاتا۔

انہیں دنوں یہ افسوس ناک خبر ملی کہ رابعہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ بمبئی سے تفصیلات ملیں کہ رابعہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں سے ملنے اپنے آبائی وطن، آندھرا پردیش کے گاؤں میں گئی ہوئی تھیں۔ وہاں ان کو بخار آیا۔ اسپتال میں ایڈمٹ ہوئیں۔ ڈاکٹر نے تشویش ظاہر کی کہ ان کو Brain Hoemorrhage ہو سکتا ہے۔ رابعہ نے بذریعہ ٹیلی فون زینب خالہ کو خبر کی جو ان کی منہ بولی خالہ تھیں اور جن کی سرپرستی میں وہ بمبئی میں رہ رہی تھیں۔ رابعہ نے کہلوایا کہ آپ فوراً آجائیں، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اندیشہ ہے کہ ہمارے گھر والے کہیں مجھے اپنے ہندو رسم و رواج کے مطابق جلا نہ دیں۔ میں اپنا آخری سفر اسلام کی روشنی میں کرنا چاہتی ہوں۔ زینب خالہ بذریعہ ہوائی جہاز آندھرا پردیش پہنچ گئیں۔ اسپتال پہنچنے کے دو گھنٹے بعد رابعہ نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں سرسام ہو گیا تھا۔

رابعہ کے گاؤں میں ہی ان کی تدفین ہوئی۔ وہ چھ سال کی ننھی پر میلا جسے برسوں پہلے اس کے گاؤں سے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا زندگی کی نیا کھیتے کھیتے تھک ہار کر دوبارہ اسی گاؤں کی مٹی میں آن ملی۔

وہ اب بھی اسلم کے نکاح میں تھی مگر وہ ظالم اطلاع پا کر بھی اس کی قبر پر دو آنسو بہانے نہیں آیا۔ حالانکہ اسے قدرت کی طرف سے سزا مل چکی تھی جب سے رابعہ کو بے گھر، بے در کیا تھا اس کا خانہ بھی آباد نہ رہ سکا تھا۔ رابعہ کو گھر سے نکالنے کے بعد وہ ملازمت کے لئے دوبئی چلا گیا تھا اور چہیتی بیوی کو اپنے والدین کے ساتھ ملیح آباد میں رکھا تھا۔ اسی دوران اس کی حسین و جمیل بیوی کا عمران نامی ایک لڑکے سے محبت کا چکر چل گیا۔ عشق پردے میں کب چھپتا ہے۔ گھر والوں کو علم ہوا تو اسلم کو آگاہ کیا گیا۔ وہ عین عید کے روز دوبئی سے ملیح آباد آیا اور اپنی بیوی کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ لاش کو پنکھے میں لٹکا کر خودکشی کا کیس بنا دیا۔ پیسہ ہو تو ایسے معاملات میں پولیس خود مدد کرتی ہے اور پھر اس بے چاری لڑکی کا

تھا بھی کون جو پیروی کرتا۔ ایک منہ بولی بوڑھی ماں تھی جسے بمبئی میں بہت دنوں بعد پتہ چلا، اور اس طرح ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی ختم ہو گئی۔ جو بیس سال پہلے بمبئی کے ایک اسکول ماسٹر کے پیار کی امانت تھی جسے اس کی ماں پیدا کر کے ایک لکڑی بیچنے والی بانجھ کے حوالے کر گئی تھی۔

امانتیں بھی کس سے کہاں سنبھلتی ہیں؟ رابعہ نے اپنی سوتن کے مرنے کے بعد اسلم کی زندگی میں دوبارہ آنے کی بھرپور کوشش کی مگر اس بے رحم انسان نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ۔

"تمہاری ہی ہائے لگی جو میرا گھر اجڑ گیا۔ میں تمہاری منحوس شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

قدرت کی مار پر بھی انسان ہٹ دھرمی کرے اور عبرت نہ حاصل کرے تو یہ اس کی بدنصیبی ہی کہا جا سکتا ہے لیکن وہ پر میاں جو نصیب کی کھوٹی تھی اپنی پیشانی پر اسلام کی روشنی لے کر دنیا سے رخصت ہوئی۔

کچھ باتیں انہونی سی لگتی ہیں۔ مگر ان کا یقین وہی کر سکتا ہے جس پر ایک باتیں گذری ہوں۔ جس رات دنیائے فانی سے رابعہ کی رخصتی ہو رہی تھی میں دلی میں اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑی بے خبر سو رہی تھی کہ اچانک بیداری کا احساس ہوا۔ تھوڑی سی غنودگی تھی۔ میں نے سنا میرے بالکل قریب سے رابعہ کی آواز جو مجھے پکار رہی تھی۔ "باجی، باجی" اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں ہر طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ رابعہ کی آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی مجھے کیا معلوم تھا کہ جانے والی نے آخری وقت میں مجھے صدا دی تھی۔

جانے والا جا بھی چکا اور قدموں کی
آہٹ اب تک راہ گزر میں زندہ ہے

آسمان پر ایک ستارہ اور ٹوٹ گیا۔ یہ 1990 کی بات ہے۔ بمبئی سے فون پر صبح ہی صبح اطلاع ملی کہ شاہ جہاں بھی چل بسیں۔ شہرِ محبت ایک ایک کر کے خالی ہو رہا تھا۔

شاہ جہاں یوں تو دل کی مریضہ تھیں۔ دل کے دونوں والب بند ہو رہے تھے۔ وہ آپریشن کے حق میں نہ تھیں۔ شوہر نے زبردستی ایک بار اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔ ہفتہ بھر بعد ان کے دل کا آپریشن ہونے والا تھا مگر وہ چپکے سے اسپتال سے بھاگ گئیں۔ شوہر سے کہا۔

"دیکھیے، موت اپنے وقت پر آئے گی ویسے بھی آپریشن کے بعد زندگی کی گارنٹی کون لے سکتا ہے؟ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ میرے آپریشن میں جو رقم خرچ کرنا چاہتے ہیں وہ میرے بعد کسی یتیم خانہ کو دے دیجیے گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

خاوند ان کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا تکلیفیں بڑھتی رہیں۔ زینے تک پر چڑھنے سے معذور ہو گئیں۔ باتیں کرتیں تو ہلکی آواز میں اور سینے پر تکیہ دبا کر۔ ایک بار تو ڈاکٹر نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب یہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روز اور زندہ رہ سکتی ہیں۔

مریض کی پیشانی پر جب موت کی تاریخ لکھ دی جائے تو وہ چین سے کب سوتا اور جاگتا ہے! مگر میں نے دیکھا، اس باہمت عورت کو جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے انتہا پرسکون تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر نمازیں پڑھتیں اور دن بھر وی سی آر پر فلمیں دیکھتیں۔ سہیلیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب لطیفے سنتیں اور سناتیں۔ اشعار سناتیں، ان سے باتیں کرتے ہوئے اکثر میں اداس ہو جاتی تو فوراً ٹوک دیتیں۔ "تم یہی سوچ رہی ہو نا کہ اب میں چند دنوں کی مہمان ہوں۔" میری آنکھوں میں آنسو آجاتے اور ڈانٹتیں۔ "پگلی کہیں کی۔ اس سرائے فانی سے تو سب کو کوچ کرنا ہے، کوئی پہلے کوئی بعد میں۔ اور پھر اس دنیا سے ملا بھی کیا ہے جو اسے چھوڑتے ہوئے غم ہو۔"

اور پھر موڈ بدلنے کے لیے انہوں نے بابل فلم کا وہ گانا شروع کر دیا جو مجھے بہت پسند ہے۔ یہ فلم بھی ہم نے ایک ساتھ دیکھی تھی۔

شاجو کے پرسوز ترنم میں یہ نغمہ کہ۔

"چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔"

اور اس وقت میری آنکھوں میں فلم کا وہ منظر زندہ ہو گیا جب آسمان سے گھوڑے پر سوار ایک نقاب پوش زمین پر اترتا ہے۔ فلم کی ہیروئن نرگس کی لاش سے اس کی روح نکلتی ہے اور گھوڑے سوار کا ہاتھ تھام کر آسمان کی سمت پرواز کر جاتی ہے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ "پلیز بند کر دیجئے یہ گانا۔" اور میں رو پڑی تھی۔

اور وہ آخری ملاقات بھی مجھے یاد ہے جب میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے خدا حافظ کہا تھا تو شاہ جہاں کی آنکھوں میں پہلی بار نمی دیکھی تھی جیسے وہ آنکھیں کہہ رہی ہوں۔

"الوداع میرے دوست۔"

آخر تقدیر پر یقین رکھنے والی یہ عورت جیت گئی۔ موت دل کے عارضہ سے نہیں بلکہ اسپتال میں ایک غلط انجکشن لگ جانے سے ہوئی۔ یہ اسپتال بمبئی کے ساحلی عدقہ چوپاٹی کے سامنے ایک خوبصورت سی عمارت میں ہے۔ اس روز اکٹھے نو مریض غلط انجکشن کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔ وہ اسپتال آج تک Sealed پڑا ہے۔

آپریشن کی رقم یتیم خانہ کو دینے کی مرحومہ کی وصیت پوری کی گئی یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں نیتوں پر سارا دارومدار ہے۔

شاہ جہاں اب بھی میرے خواب میں اکثر آتی ہیں۔ انتہائی خوش پوش، ہنستی، مسکراتی، لگتا ہے انسانوں کے مقدر میں آنسو لکھنے والا آسمان پر صرف مسکراہٹیں تقسیم کرتا ہے۔

ایک بار پھر تنہائی کے بھنور میں ڈوب گئی۔

زندگی کی سنسان راہوں میں کبھی کبھی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی تو میں چونک پڑتی اور ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح سہم جاتی کیا پتہ آنے والا جھونکا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ مگر کون روک سکتا ہے ہواؤں کو؟ آہٹوں کو؟ یہ آزاد ہیں، بالکل خیالوں کی طرح۔ جب چاہیں جہاں چاہیں پہنچ جائیں۔ جسے چاہیں زندگی بخش دیں جسے چاہیں تباہ کر دیں۔

تباہ ہونے کی آرزو ہر کوئی نہیں کرتا۔ جانے کیوں ہر معاملے میں لوگوں سے

منفرد ہوں۔ جب جب زخم ملے تب تب مسکرائی ہوں۔

خوشبو کے احترام میں یہ حادثہ ہوا
ہم نے گلوں کے دھوکے میں کانٹوں کو چھو لیا

اور اب تو ہر سمت کانٹے ہی کانٹے تھے۔ جہاں قدم رکھتی لہو لہان ہو جاتی۔ زخمی زخمی روح لیے جانے کیسے کیسے صحراؤں میں بھٹکتی رہی، دوڑتی رہی۔ بے تحاشہ بھاگتی رہی۔ کبھی کبھی کوئی ابرِ باراں دکھائی دیتا تو تشنہ لبی پکار اٹھتی۔

مجھ کو کوئی اپنا دے
اس جنگل میں رستہ دے
سب کو سمندر دیتا ہے
مجھ کو بھی ایک قطرہ دے

محرومیاں ہی نصیب میں ہوں تو کوئی کیا کرے۔ جو بھی ساحلِ دل پہ اترا ٹوٹی ہوئی کشتی کا نظارہ کر کے لوٹ گیا۔ اور ———

اس بے چراغ شہر میں، میں کھو کے رہ گئی
منزل کہاں کہ کوئی بھی رستہ نہیں ملا
دیکھا تھا جس پہ رکھا ہوا چاند ایک بار
پھر عمر بھر مجھے وہ دریچہ نہیں ملا...!!

جب پتھر بول اُٹھے

یہ اس برسات کی بات ہے جب بادل کم اور آنکھیں زیادہ برسی تھیں۔ جانے کیا تھا جو میرے اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ ہر وقت ایک اداسی وجود پر محیط رہتی۔ زندگی میں خلاء پر خلاء بنتا جا رہا تھا۔ ہر طرف فریب، جال دھوکے اور میں کبھی ان سے دامن بچاتی کبھی دامن چھڑاتی، زندگی سے کترا کر نکل رہی تھی۔ مگر کہیں تو کوئی پڑاؤ ہو، کوئی منزل ہو، جہاں مسافر ٹھہر کر دم لے لے۔ راہ کے سارے درخت بے سایہ تھے۔

انہیں دنوں میں نے اورنگ آباد کا سفر کیا۔ اورنگ زیب بادشاہ کا مزار دیکھا جس کی کچی قبر پر گلاب رکھ کر فاتحہ پڑھی تو لگا روح کے ہر گوشے میں خوشبو بکھر گئی ہو۔ سنگ تراشی کا خوبصورت نمونہ ایلورا کی مورتیاں دیکھیں جن کے نزدیک جا کر لگا۔ فنکار ان کی تکمیل کر کے بس گویائی دینا بھول گیا ہو۔

پہاڑوں پر آباد یہ پتھروں کی بستی انسانوں کے شہر سے کہیں اچھی لگ رہی تھی۔ جیسا کہ ان مقامات پر عام طور پر ہوتا ہے کہ ہر نمایاں پتھر پر سیاح کچھ نہ کچھ لکھ جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا وہاں زیادہ تر پریمی جوڑوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ مگر ایک پتھر ایسا بھی دیکھا جس پر ایک تنہا نام تھا۔ 'آشا'۔ یہ نام اپنے آپ میں ایک کہانی سمیٹے ہوئے تھا۔ لکھنے والے نے کتنا کرب سہا ہوگا جب اس نام کے ساتھ دوسرا نام نہ لکھ پایا ہوگا۔

تھوڑا آگے چل کر ایک چٹان نما پتھر ملا جس پر صرف سن اور تاریخ لکھ کر اس

کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا گیا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہو چکی تھی اسی پتھر پر جا کر بیٹھ گئی اور اب اس سوالیہ نشان کی جگہ میں تھی۔!

یوں تو اس سفر میں قدم قدم پر میں تنہا تھی اگر کبھی کسی لمحہ کسی کی رفاقت کا احساس ہوا بھی تو لگا ایک سایہ تھا جو میرے اندر سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ کاش میں بھی ان پرچھائیوں کی مانند ہوتی۔ جب چاہتی کھو جاتی، گم ہو جاتی، تحلیل ہو جاتی۔ ہاں واپسی پر یہ ضرور ہوا کہ ایلورا کے بلند پہاڑوں کے سینے میں ایک دھڑکن چھوڑ آئی۔ راستہ میں ''بیک فورٹ'' کی ٹوٹی ہوئی دیواروں نے روک کر کہا۔

''مایوس نہ ہو ہمیں دیکھو تاریخ میں ہمارا ایک مقام ہے۔ سیاح دور دور سے ہمیں دیکھنے آتے ہیں مگر ہم ایک بار ویران ہوئے تو پھر آباد نہ ہو سکے۔''

''بی بی کے مقبرہ'' سے گزرتے ہوئے ہم ''پن چکی'' پہنچے ایسا لگا کسی کے عشق میں بہائے ہوئے تمام آنسو پن چکی کے حوض میں آکر جمع ہو گئے ہیں۔

یہ پتھریلا تاریخی شہر بہت اچھا لگا۔ سبب آج تک معلوم نہیں۔ ایسا لگتا تھا یہاں کی ہر شئے بول رہی ہو۔ دور دور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں، چوڑی سڑکیں سیدھے سادے ایماندار آٹو رکشہ والے، ہر طرف ہریالی اور درختوں کے ٹھنڈے سائے۔ یہ شہر اتنا اچھا لگا کہ بمبئی کے پرسکون ساحل، بنارس کی صبح، اودھ کی شام اور دتی کا تاریخی مینا بازار بے معنی لگنے لگے۔ منظر کی خوبصورتی کا تعلق دل سے ہے اور یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ دل کن مراحل میں تھا۔!

مجھے بیلے اور موتیا کے پھول بہت پسند ہیں۔ گل منڈی میں ایک گل فروش سے پھول مانگا تو کہنے لگا۔ ابھی خوشبو والے پھولوں کا سیزن نہیں ہے۔ بغیر پھول لیے میں ہوٹل ''گیتا انجلی'' لوٹ آئی جہاں میرا قیام تھا۔

اور میں اس موسم کا آج تک انتظار کر رہی ہوں شاید ہمیشہ کرتی رہوں گی، جب گل منڈی کے پھولوں میں خوشبو آجائے۔

کیسی پاگل تھی پھولوں کی خواہش لیئے
زرد موسم میں کانٹوں پہ چلتی رہی
داغ چہرے کے پھر بھی نہیں مٹ سکے
زندگی آئینے تو بدلتی رہی...

وہ مر کر زندہ ہو گئی

قمر جہاں رضوی سے میری شناسائی 1987 میں ہوئی۔ وہ ذاکر نگر میں میرے سامنے والی گلی میں رہتی تھیں۔ پچاس پچپن سال کی وہ ایک سنجیدہ خاتون تھیں۔ امروہہ کی رہنے والی تھیں۔ اوکھلا کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔ خوش اخلاق، خوش گفتار، اور ملنسار تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ مجھ سے اور میرے بچوں سے کافی گھل مل گئیں۔ ان کی ذاتی زندگی میرے لئے نامعلوم ہے، جو ظاہر تھا وہ یہ کہ وہ بیوہ بھی تھیں اور مطلقہ بھی۔ اولاد سے محروم تھیں۔ ان کے تیسرے شوہر نے اپنی دوسری شادی کر کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ دو منزلہ ذاتی مکان تھا جس میں وہ تنہا رہتی تھیں۔ ایک بہن تھیں جو پرانی دلّی میں رہتی تھیں، بھائی امروہہ میں تھے۔

تنہائی کا زہر جو پیتا ہے ذائقہ بھی اسی کو معلوم ہوتا ہے ہم تو صرف لوگوں کے بارے میں قیاس آرائیاں ہی کرتے ہیں۔ زمانے کی ستائی ہوئی اور دکھوں کی ماری تھیں۔ اکثر اسکول سے ہمارے گھر آجاتیں اور رات دیر گئے تک ہمارے ساتھ بات چیت میں مشغول رہتیں۔ باتونی زیادہ تھیں اس لئے وقت کا پتہ نہ چلتا اور میرا بھی اچھا وقت گزر جاتا۔

ایک بار ہم نے اجمیر شریف کا سفر ساتھ میں کیا تھا۔ بہت اچھا لگا تھا۔ واپس آئے تو سفر کی تھکن کے ساتھ خواجہ غریب نوازؒ کے در کی کچھ نورانی یادیں بھی ساتھ لائے تھے۔ "انا ساگر" اور "تارا گڑھ" کے پہاڑوں کی سیر کے ساتھ وہ کچھ ملول تھیں۔ میرے

پوچھنے پر وہ ٹال گئیں۔ شاید انہیں پچھلے زمانوں کا کوئی خوبصورت لمحہ یاد آگیا ہو۔ ایسے مقامات پر، ماضی ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔

1988 میں، میں ذاکر نگر کا مکان فروخت کر کے ابوالفضل انکلیو میں آ گئی۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اب ہماری ملاقات کم ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی ہم اپنے دکھ درد کہنے کے لئے کبھی کبھار ملاقات کے لئے موقع نکال لیا کرتے تھے۔

میں ان دنوں نوئیڈا میں ایک مکان کی تعمیر میں بے حد مصروف تھی۔ بہت دنوں سے قمر سے ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ سوچ ہی رہی تھی کہ کسی دن جا کر معذرت کرلوں گی مگر افسوس کہ قدرت نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ ایک شام خبر ملی کہ قمر جہاں کا قتل ہو گیا۔ میرے پیروں تلے کسی نے جلتی ہوئی آگ رکھ دی۔ یقین نہیں آیا، ذاکر نگر پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہ سچ ہے۔

لوگوں نے بتایا کہ قمر جہاں کے مکان کے گیٹ میں گزشتہ تین دنوں سے تالا لگا ہوا تھا۔ اکثر وہ اپنے میکے امروہہ بھی جایا کرتی تھیں۔ پڑوسیوں نے یہی سمجھا کہ وہ دہلی سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ تیسرے روز جب مکان کے اندر سے بدبو آنے لگی تو پولیس کو اطلاع کی گئی اور جب تالے کھولے گئے تو دیکھنے والوں نے وہ منظر دیکھا جو دل کو ہلا دینے والا تھا۔ قمر جہاں کی لاش نائٹ ڈریس میں بستر پر سڑ گل کر پڑی ہوئی تھی۔ ان کے گلے سے سونے کی چین، بندے اور ہاتھ کی چوڑیاں بھی غائب تھیں۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ گھر کا سامان بھی درہم برہم تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ گرمی کا موسم تھا، تین روز میں لاش اس قدر متعفن ہو گئی تھی کہ گٹھری باندھ کر پوسٹ مارٹم کے لئے لے جایا گیا۔ لہٰذا مفتی سے شرعی اجازت لے کر بغیر غسل کے حضرت نظام الدین کے علاقہ میں تدفین کر دی گئی۔

اس سلسلے میں کئی لوگ گرفتار ہوئے، پھر رہا کر دیے گئے۔ سنا تھا کہ قاتل بھی پکڑے گئے تھے۔ جو اسی علاقے کے رہنے والے ٹیکسی ڈرائیور اور موٹر مکینک تھے اور انہوں نے اقبال جرم بھی کیا اور بتایا کہ قتل چوری کے لئے کیا گیا۔ کیس تو پولیس خود بناتی

ہے۔ حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اصلی مجرم کون ہے؟

پھر سنا کہ جنہوں نے جرم قبول کیا تھا، رہا کر دیے گئے۔ اس قتل کے پیچھے پیسے کا لالچ، مکان کا لالچ، یا کسی مرد کا انتقامی جذبہ کام کر گیا، کون بتا سکتا ہے؟۔

بہر حال! قمر جہاں کے ساتھ یہ راز بھی دفن ہو گیا۔ کچھ لوگ مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ قمر جہاں کا نام بھی انہیں لوگوں کی فہرست میں رہے گا۔

بہت دنوں بعد اتفاقاً میں ایک روز ان کی گلی سے گزری۔ مکان پر نظر پڑی تو دیکھا، "قمر منزل" کی جگہ اب "رضوی منزل" کی تختی لگی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ قمر جہاں کے بھائی کی فیملی اب اس میں رہتی ہے کیوں کہ اب قانونی وارث وہی ہیں۔ راستہ بدنے والے منزلیں بھی بدل دیتے ہیں۔ جانے والی نے سوچا ہوگا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ !!

بے لوث جذبے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ بہ ظاہر خشک مزاج اور تلخ گفتار ہوتے ہیں اندر سے بہت نرم، مخلص اور سوشل ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ہستی کا ذکر کر رہی ہوں جن کا نام عطیہ ہے۔ عطیہ آپ مولانا رشید احمد گنگوہی کی پڑپوتی ہیں۔ شادی نہیں کی، بڑے بھائی کی سرپرستی میں زندگی کا کافی حصہ گزار چکی ہیں۔ ویسے عادتاً بہت نیک، مخلص اور اللہ والی ہیں۔ محدود لوگوں سے ملتی ہیں۔ ان سے میرے مراسم ذاکر نگر سے چلے آ رہے ہیں۔ تقریباً بارہ سال ہو گئے۔ ان کے قرب میں رہ کر ایسا لگتا ہے قلب کی اصلاح ہو رہی ہو۔ عطیہ آپا ایک دکھی خاتون ہیں مگر دکھوں کو امانت سمجھ کر دل میں رکھتی ہیں۔ لوگوں سے اس کا اظہار نہیں کرتیں۔ ان سے مل کر ایک عجیب سی روحانی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ایک خاص عادت ہے کہ وہ خوشیوں میں کم، اور مصائب میں لوگوں کا زیادہ ساتھ دیتی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ان کا سلوک یکساں ہے۔

ایک بار میں "جیون نرسنگ ہوم" میں ایڈمٹ تھی۔ میرا ایک آپریشن ہوا تھا۔ عطیہ آپا نے میرے سرہانے بیٹھ کر پورا ہفتہ گزار دیا۔ میرے سر میں تیل، بالوں میں کنگھی، ہر وقت میری تیمارداری میں لگی رہتیں۔ میرا جی گھبراتا تو مجھے کتابیں پڑھ کر سناتیں۔ ان کی حوصلہ افزاء باتیں سن کر تکلیف دور ہو جاتی۔

وہ میرے لیے غیر ہو کر بھی ہمیشہ اپنی سی لگیں۔ میں ان کی محبتوں کا احسان کبھی

نہیں اتار سکتی۔

ایک بار کا ذکر ہے۔ میں نے اپنا مکان جن صاحب کو فروخت کیا تھا انہوں نے رقم کی ادائیگی وقت پر نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرا مکان بنوانے کے لئے میں نے جو پلاٹ خریدا تھا اس کی Payment کے لئے میرے پاس رقم کم پڑ گئی۔ Agreement پورا ہونے میں صرف دو روز رہ گئے تھے کوئی انتظام نہ ہونے کی صورت میں کافی رقم ضائع ہو جاتی۔ میرا پریشان ہونا فطری بات تھی۔ میں فکر مند سی اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اس وقت عطیہ آپا آئیں۔ تمام حالات سنے اور تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، اللہ انتظام کرنے والا ہے۔ گھر گئیں تھوڑی دیر بعد رومال میں لپٹی ہوئی چند نوٹوں کی گڈیاں لے کر آئیں اور میرے سامنے رکھ دیا۔ پورے پچاس ہزار روپے تھے۔ میں ان کا چہرا دیکھنے لگی، بولیں۔

"کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اپنی ضرورت پوری کرو جب مکان بکے گا مجھے واپس کر دینا۔"

اور اس پیسے کی نہ ہی کوئی رسید مجھ سے لی نہ مکان بکنے تک مجھ سے تقاضا کیا۔ چار مہینے بعد ان کے پچاس ہزار لوٹا دیئے مگر وہ احسان جو انہوں نے مجھ پر کیا کبھی اتارا نہیں جاسکتا۔!!

اے مرد تیرے کتنے روپ؟

معاشرے میں تنہا عورت کا مقام ایک کٹی پتنگ کی طرح ہوتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے اکثر شریف اور مہذب لوگ بھی گھٹیا پن پر اتر آتے ہیں۔ایسی ہی ایک مثال دہلی کے ایک ڈاکٹر کی ہے۔

یہ 1984 کی بات ہے۔ بخار وغیرہ کے سلسلے میں ان دنوں میں زیرِ علاج تھی۔ ڈاکٹر محلے کا ہی تھا۔ پہلے ہی دن گھر آکر میں نے دوا کا غلافہ کھولا تو گولیوں اور کیپسول کے ساتھ ایک پرچہ بھی ملا۔ جس پر کوئی شعر درج تھا۔ میں نے ایک طرف پھینک دیا اور اسے اتفاق سمجھا مگر دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اور اب کے جو شعر لکھا تھا اس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ۔ ”محبت کا جواب محبت سے دیں، ٹھکرائیں نہیں۔“ میں نے ضبط کر لیا، تیسرے روز بھی پڑیا میں پرچہ نکلا، لکھا تھا۔

”محترمہ!

آپ کے دل تک پہنچنے کے لیے کن الفاظ کا سہارا لوں؟“

اور اس بار یہ پرچہ اپنے ایک خالہ زاد بھائی کو دکھایا۔ وہ غصہ سے دل پیلے ہو گئے۔ میں نے بہت سمجھایا کہ بات آگے نہ بڑھائیں لیکن وہ نہ مانے کلینک پہنچے اور ڈاکٹر کو باہر بلایا اور کہا۔

”دوا کی پڑیا میں محبت نامہ رکھنے کی کون سی سزا دوں؟“ وہ ڈاکٹر فوراً ہاتھ جوڑ کر

کھڑا ہو گیا۔

"مجھے معاف کردیں، اب ایسا کبھی نہیں ہوگا"۔

ایسا ہی ایک واقعہ بمبئی کا یاد آرہا ہے۔

ڈاکٹر ایرانی تھا اور ہومیو پیتھک علاج کرتا تھا۔ ہاتھ میں بہت شفا تھی۔ ہنس مکھ، ملنسار اور خوبصورت تھا۔ دوا سے زیادہ اس کا شیریں لہجہ مریضوں پر اثر کرتا تھا۔ میں بھی اکثر اس کے زیر علاج رہی۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا۔ "آپ بہت اچھی ہیں"۔

"ہو سکتا ہے مگر میری اچھائی سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔" میں اٹھ کر چلنے لگی تو اس نے مجھ سے معذرت چاہی اور بہت شرمندہ بھی ہوا۔

بہر حال! اس روز کے بعد سے وہ بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ہمیشہ نظریں جھکا کر بات کرتا۔ ایک بار میں جب دواخانے پہنچی تو وہ تنہا ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک عورت کی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں میں اتری نمی خشک کرنے لگا۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا حال بتاتی وہ کہنے لگا۔

"یہ تصویر میری بیوی کی ہے جس کی برسوں پہلے ڈیتھ ہو چکی ہے۔ مگر آج تک میں اسے بھول نہیں سکا۔ نہ ہی دوسری شادی کی۔"

ایسے موقعوں پر، ہمدردی کے جو جملے کہے جاتے ہیں میں نے بھی رسم ادا کی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے سوچا واقعی یہ دکھی ہے۔ سنا تھا کہ مرد بڑا صابر ہوتا ہے، صدمہ شدید ہو تبھی اس کے آنسو نکلتے ہیں۔

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک بار میں کلینک میں بیٹھی تھی، ڈاکٹر میرا BP چیک کر رہا تھا کہ ایک محترمہ ڈاکٹر کے پاس آئیں جن کی شکل ہو بہو تصویر والی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا کہ مُردے بھی اب دوا لینے آنے لگے۔ ڈاکٹر نے اپنی پیشانی پر آیا پسینہ پونچھا۔ اسی وقت وہ عورت ڈاکٹر کو چابی کا ایک گچھا تھماتے ہوئے بولی۔

"میں پارٹی میں جا رہی ہوں، واپسی دیر سے ہوگی، آپ کھانا کھا لیجئے گا۔" وہ چلی گئی اور ڈاکٹر نے میرے بازو سے SPHEGNOMENO METER نکالتے ہوئے کہا۔

"آپ سوچ رہی ہوں گی، یہ ڈاکٹر کتنا جھوٹا ہے کہ اچھی خاصی بیوی کو مردہ بتادیا۔ دراصل اس طرح میں آپ کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا مگر ناکام رہا اور آج اس نتیجہ پر پہنچا کہ جھوٹ انسان کو ہمیشہ ذلیل کرتا ہے۔ لوگوں کی نظروں میں گرا دیتا ہے۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں آپ اس قدر شرمندہ نہ ہوں، یہ فطرتِ مرد ہے جو بدل نہیں سکتی۔" میں کلینک سے باہر نکل آئی اور پھر کبھی نہیں گئی۔ کیا پتہ آج بھی وہ ڈاکٹر ٹیبل پر اپنی بیوی کی تصویر رکھ کر کسی پتھر کو پگھلانے کی کوشش کر رہا ہو۔!

جھوٹ مکاری، فریب شاید مرد کی سرشت میں داخل ہے اور ہمیشہ اس کا نشانہ رہی ہے بے سہارا تنہا عورت، گویا تنہائی ایک جرم ہے۔ اگر بے شوہر کی عورت اچھے کپڑے پہن لے تو محلے پڑوس کے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتے ہیں اور بیویاں اپنے شوہروں پر نگاہ کڑی کرلیتی ہیں۔ یہاں عورت بھی عورت کی دشمن ہے۔ اگر کبھی گھریلو اشیاء کی خریداری کے لئے گھر سے نکلے تو لوگ سمجھتے ہیں اپنے کسی عاشق سے ملنے جارہی ہوگی۔ ایسی ایسی قیاس آرائیاں اور الزام تراشیاں شروع ہو جاتی ہیں کہ فرشتے بھی پناہ مانگتے ہیں۔ کوئی رشتہ دار یا واقف کار گھر میں آجائے تو سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور پھر گھروں کی نیک بیبیاں کسی نہ کسی بہانے ٹوہ لینے آجاتی ہیں۔ ایسی عورت ہر لمحہ نشانہ کی زد پر رہتی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ تنہا ہے۔ اگر گھر کا دروازہ بند کر کے وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو تو بھی شک کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان عورتوں کے بارے میں خبر نہیں رکھی جاتی جو شوہروں کے گھر سے نکلتے ہی غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی کسی کو پتہ بھی چل جائے تو لوگوں کی ہمت نہیں ہوتی لب کھولنے کی کیوں کہ اس کا خاوند جو ہے، گویا خاوند عورت کے لئے ڈھال ہے۔ ایک پردہ ہے ایک سایہ ہے، ایک آڑ ہے۔

ایسے سماج میں رہنے سے تو اچھا ہے کہ جنگل میں جا بسے، جنگل کے جانور ایک بار میں ہی کھا چبا کر قصہ ختم کر دیں گے۔ مہینوں، سالوں اور قسطوں میں بوٹی تو نہیں نوچیں گے۔!!

پاسبانِ ادب

ادبی حلقوں کے جن لوگوں سے میں متاثر ہوں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔
جناب بیکلؔ اتساہی، آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، ندا فاضلیؔ، افتخار امام صدیقی، کیفؔ بھوپالی، تابشؔ مہدی، فصیحؔ اکمل، رفعت سروشؔ، شاہد پرویز، پروفیسر عنوانؔ چشتی، حاجی انیس دہلوی، اور جاوید قمرؔ، ان پر خلوص ہستیوں کا ذکر نوکِ قلم پر آتے ہی لگتا ہے کہ صفحات پر بے شمار موتیوں کے دانے بکھر گئے ہوں۔

میرے شعری ذوق کو ابھارنے میں بیکلؔ اتساہی صاحب کی پر خلوص رہنمائی شامل ہے۔ ابتدا میں اپنے کلام پر انہیں سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ بزرگ شاعروں میں بیکلؔ صاحب اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ۔

اداس کاغذی موسم میں رنگ و بو رکھ دے
ہر ایک پھول کے لب پر میرا لہو رکھ دے
سمندروں نے بلایا ہے تجھ کو اے بیکلؔ
تو اپنی پیاس کی صحرا میں آبرو رکھ دے

جب سے ہم تباہ ہو گئے
تم جہاں پناہ ہو گئے

دشمنوں کو چٹھیاں لکھو
دوست خیر خواہ ہو گئے
وہ گھٹا گھری کہ سے کدے
جل کے خانقاہ ہو گئے

تو حرف حرف ان کے خوبصورت کردار کی علامت بن جاتا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، جو ان سے ایک بار مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت بابا گرونانک کی ۱۴ ویں پشت کی شناخت تھی۔ امیر اور غریب ان کے لئے یکساں تھے۔ مزاج میں شان خسروی، اور ادائے درویشانہ تھی۔ ان دنوں میں CONSTRUCTION کے کام میں اس قدر مصروف تھی کہ ان سے رابطہ نہ کرپاتی تھی۔ وہ جس روز اسپتال میں داخل ہوئے اپنے تمام دوستوں، واقف کاروں کو فون پر اطلاع دی کہ اب ڈاکٹر ان کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور وہ سب سے ملنا چاہتے ہیں۔

جب میں آخری بار ان کی عیادت کے لئے اسپتال گئی تو دیکھا زندگی کی تمام تھکن ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اور روح کا بے چین پرندہ اپنے آخری سفر کی پرواز کے لئے پر تول رہا ہے۔ میں ضبط نہ کرسکی میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کنور صاحب مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ ہر روز فون پر میری خیریت پوچھنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ شہریا ملک سے باہر ہوتے تب بھی مجھے خط لکھتے، فون کرتے اور اب یہ سارے رابطے ٹوٹ رہے تھے۔

اور افسوس تو یہ ہے کہ اس روز میں بمبئی میں تھی جب مجھے خبر ملی کہ کنور صاحب اب نہیں رہے۔ وقتِ رخصت اپنی غیر حاضری کا پچھتاوا ہمیشہ رہے گا۔

ندا فاضلی سے میری ملاقات بمبئی میں ان کے فلیٹ پر ایک ادبی نشست میں ہوئی تھی۔ ان کی شاعری کا انداز اور لہجے کی برجستگی مجھے بہت پسند ہے وہ دوست بنانا جانتے ہیں اور نبھانا بھی۔ ایک بار وہ دہلی میں ہمارے گھر بھی تشریف لائے اور محسوس ہوا کہ فسول

میں خوب صورت نغموں کا رنگ بھرنے والا کتنا سادہ، کتنا مخلص اور کتنا غمگسار ہے۔

افتخار امام صدیقی، ایک شاعر، ایک صحافی اور ایک دردمند شخصیت کا نام ہے۔ ان کے خوبصورت کردار کا عکس ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو ہمارے غریب خانے پر تشریف لا کر اپنا قد مزید بڑھا لیتے ہیں ان کے ترنم میں بلا کا سوز ہے۔ جب وہ اپنی کوئی نظم یا غزل سناتے ہیں تو لگتا ہے کہ آسمان سے فرشتے اتر کر ہمہ تن گوش ہو گئے ہیں۔

کیف بھوپالی۔ شاعری کی دنیا کا یہ ستارہ ٹوٹ کر بھی آسمانِ ادب پر ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ کیف صاحب سے میری ملاقات دلّی کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی جو کہ سیلم پور کے علاقہ میں منعقد ہوا تھا اور یہ توقع کے برعکس بڑا ہی کامیاب مشاعرہ تھا۔ جو صبح پانچ بجے تک چلتا رہا جس میں کئی نامور شعراء شریک تھے۔ کیف صاحب کو بار بار زحمتِ سخن دی جاتی۔ وہ ایک مصرعہ پڑھتے دوسرا بھول جاتے۔ وہ ہر وقت ایک وجدانی کیفیت میں پائے جاتے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر گھر کے لئے ہم جس گاڑی میں بیٹھے اس میں بشیر بدر، والی آسی، اعجاز بھارتی، اور کیف صاحب تھے۔ سب کو ان کی قیام گاہ پر ڈراپ کر دیا گیا مگر کیف صاحب بولے۔

"بھئی میں تو شمع کے گھر جاؤں گا"۔ میں بہت تذبذب میں پڑ گئی۔ ساتھ میں میرے بھائی تھے انہوں نے کہا۔ "ضرور چلیں ہمیں خوشی ہوگی۔" اور اس طرح کیف صاحب ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ مسلسل تین روز قیام کیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہر وقت میری دونوں بیٹیوں فوزیہ اور دیبا کو آواز دیا کرتے۔

"ارے بھئی بچیوں ادھر تو آؤ کیا پکار رہی ہو؟ سنو! میرے لئے پکوڑیاں بنا دو"۔ کبھی کہتے۔ "میرے لئے پراٹھے بنا دو"۔ اس وقت ہمیں یہ سادہ لوح انسان بہت عظیم لگتا۔ پاکیزہ، شنکر حسین اور رضیہ سلطان جیسی یادگار فلموں کے گانے لکھنے والا اور کتنی ہی مشہور اور منفرد غزلوں کا خالق جب مجھ سے فرمائش کرتا کہ شمع اپنا کلام سناؤ تو بخدا میں اس سورج کے سامنے چراغ جلانے کی ہمت نہ کر پاتی۔ پھر بھی سنانا ہی پڑتا اور وہ خوب داد دیتے، کیف

صاحب اپنے دلدار کے ساتھ چاند کے پار جا چکے ہیں مگر یہ زمین والے انہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

تابش مہدی جتنا خوبصورت نام ہے اتنی ہی دلکش شخصیت بھی۔ اپنے شعروں میں جادو جگاتے ہیں۔ وہ میرے پڑوسی بھی ہیں اور منہ بولے بھائی بھی۔ ایسی ہستیاں جہاں موجود ہوں اس علاقہ کا نام ابوالفضل ہی ہونا چاہئے۔

رفعت سروشؔ اور فصیح اکملؔ سے بھی میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ انہیں کی طرح میرے تمام ادب نواز دوستوں کو مجھ سے یہ شکایت رہتی ہے کہ میں ان کی ملاقات سے کتراتی ہوں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ سمٹ کر رہنا کچھ تو طبیعت میں شامل ہے اور کچھ بے پناہ مصروفیت خلوص کا حق ادا نہیں ہونے دیتی۔

پروفیسر عنواںؔ چشتی سے میرے پر خلوص مراسم رہے ہیں۔ اس کی وجہ شاعری نہیں بلکہ ان کا مسلک بھی ہے۔ وہ اہل سلسلہ ہیں اور میں بھی۔ وہ ایک مخلص دردمند انسان ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ ان کے بارے میں مشہور یہ بات کہاں تک درست ہے کہ وہ بہت عاشق مزاج ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ صوفی اگر عاشق مزاج نہ ہو تو راہِ سلوک طے نہیں کر سکتا اور پھر عشق تو چشتی سلسلے کی روح ہے۔

مجھے یاد ہے اس وقت تک میں نے کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا تھا۔ اسٹیج پر جانے سے بہت گھبراتی تھی۔ عنواںؔ چشتی صاحب اکثر دعوت نامے لے کر آتے اور بضد ہوتے کہ میں مشاعروں میں شریک ہوا کروں۔ لیکن میں ہمیشہ منع کر دیتی۔

ایک بار کا ذکر ہے دہلی ہی کے کسی ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ جس میں عنواںؔ چشتی صاحب صدرِ مشاعرہ تھے آئے اور کہنے لگے۔ "بھئی پڑھنا نہیں چاہتیں تو سننے کے لئے ہی چلو۔" ان کے بے حد اصرار پر میں راضی ہو گئی اور مشاعرہ سننے کی غرض سے شرکت کی۔ اسٹیج کے بالکل سامنے والی پہلی رو میں انہوں نے بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب شعراء کو اسٹیج پر آنے کے لئے اناؤنس کیا گیا تو اس میں اپنا نام سن کر میرے اوسان جاتے رہے۔ میں لرز گئی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جی چاہا لوگوں کی نظریں بچا کر کسی دروازے

سے باہر نکل جاؤں۔ مگر ایسا نہ کر سکی۔ اسٹیج پر پہنچ گئی۔ جب تک کلام پڑھنے کی باری نہ آئی تھی سوچوں کا عذاب مسلط تھا۔ کیسے پڑھوں گی؟ کوئی تیاری بھی نہ تھی نہ ہی آداب مشاعرہ سے واقف تھی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ جب موقع آیا تو بڑے ہی Confidence سے پڑھا اور خوب داد حاصل کی۔ لہٰذا عنوان صاحب کا دھوکے سے مجھ سے کلام پڑھوانا آگے چل کر سودمند رہا۔ میری جھجک ختم ہو گئی۔

شاہد پرویز سے میرے مراسم تقریباً بیس سال سے ہیں۔ کافی عرصہ تک صرف کاغذی ملاقات رہی۔ دلّی آنے کے بعد ان سے گھریلو مراسم بھی قائم ہو گئے۔ انسان اچھائیوں اور برائیوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ان میں کچھ خامیاں ہیں تو خوبیاں بھی پوشیدہ نہیں۔ انسانیت کی معراج یہی ہے کہ ہر کسی کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اس کی خوبیوں پر نگاہ رکھے۔ شاہد صاحب کی خوبیاں شمار کرتی ہوں تو کئی پیارے پیارے احسانات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اپنے ناول ''سنگریزے'' اور ''دلہن بانو'' میں تیر و نشتر چلانے والے ادیب کا بے ساختہ انداز بھی نشتر سے کم نہیں۔ وہ ایک بے باک اور حق گو ادیب ہیں اور ان دنوں تبلیغی جماعت سے منسلک ہو گئے ہیں۔ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی دیکھا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا کرتا پاجامہ، سر پر ٹوپی اور ان کی سفید ریش بزرگی کو دیکھ کر بڑی دیر تک یقین نہ آیا کہ یہ شاہد پرویز صاحب ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دلوں کی حالت بدلنے کا وقت مقرر ہے جو صرف اوپر والا ہی جانتا ہے۔!

حاجی انیس دہلوی ماہنامہ ''فلمی ستارے'' اور ''باجی'' کے ایڈیٹر ہی نہیں ایک مخلص انسان بھی ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ شاعری کی طرف متوجہ ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کا کلام نظر سے گزرتا ہے۔ اچھا کہتے ہیں۔ جب سے فالج کے اثر میں آئے ہیں قوت سماعت جاتی رہی۔ ان سے بات کرتے وقت جواب لکھ کر دینا پڑتا ہے۔ اس حال میں بھی وہ اکثر فون کرتے ہیں۔ جب اپنی یک طرفہ بات پوری کر لیتے ہیں تو ان کی سکریٹری یا کبھی کبھی صاحبزادی میرا جواب لکھ کر انہیں پڑھواتی ہیں۔ اس وقت مجھے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور سوچتی ہوں حال سننے والے یوں بھی سنتے ہیں۔

خوابوں کے ٹوٹ جانے کا ڈر دے گیا مجھے
اک شخص جاگنے کا ہنر دے گیا مجھے
کچھ خواب میری جاگتی آنکھوں کو بخش کر
وہ آندھیوں میں ریت کا گھر دے گیا مجھے
میرے قریب سے گزرا نہ کوئی سنگ تراش
مجسمہ ہوں، میں اب تک مگر چٹان میں ہوں
دل کی سونی چھت پر وہ ایک بار آیا تھا
آج بھی خیالوں کی سیڑھیاں مہکتی ہیں

اتنے خوبصورت اشعار کہنے والا شخص کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا، جس کے کلام کا حرف حرف روح میں وجدانی آبشار کی طرح بہتا ہے۔ ذہنوں سفر کرنے والے اس شاعر کا نام ہے جاوید قمر۔

یہ گزشتہ کئی برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔ نام ونمود کی خواہش نہیں۔ دوست احباب کے اصرار پر کبھی کبھار ٹی وی پر آ جاتے ہیں۔ صحافت سے منسلک ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ ضلع گونڈہ ان کا آبائی وطن ہے جہاں کی سرزمین ایسے ایسے شاعر عطا کرتی ہے جو تاریخ کے سینے پر چراغ کی طرح روشن رہیں گے۔ جاوید قمر کا ترنم بھی اچھا ہے۔ بہت کم گو ہیں مگر جب کچھ کہتے ہیں تو لگتا ہے سناٹوں کے ماحول میں خاموشی چیخ پڑی ہو۔ ان کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے ؂

اپنے دیے کو چاند بتانے کے واسطے
بستی کا ہر چراغ بجھانا پڑا مجھے.....!!

اور قلم مجبور میرا

فنکار بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ میرے فنکار ہونے کا جواز اسی مقولہ میں پوشیدہ ہے۔ میں جب شعور کی منزل میں پہونچی تو طبیعت از خود شعر و شاعری اور کہانیوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہو گئی۔ حساس میں بچپن سے ہوں۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑ جاتے اور میں پہروں ان کے بارے میں سوچا کرتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، نانا جان جب بھی گاؤں سے شہر جاتے، تو واپسی پر ان کے تھیلے میں اردو کی کتابیں اور رسالے ہوتے۔ انہیں اچھی کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ میں ان کے لائے ہوئے رسالے اور کتابیں اکثر چھپ چھپ کر پڑھا کرتی۔ اس وقت بھی نہ جانے کیوں مجھے وہی کہانیاں اچھی لگتیں جن میں زندگی کی برہنہ سچائیوں کو اجاگر کیا گیا ہوتا۔ شاید میرے لاشعور میں کہیں نہ کہیں باپ سے ملی نفرت اور بچپن کی وہ محرومی پوشیدہ تھی جو میرا حصہ بنی۔

میرے مطالعہ میں آنے والی پہلی کہانی کون سی تھی؟ یاد نہیں، البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت تک میں عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے نام سن چکی تھی۔ کرشن چندر اور بیدی کی کہانیاں جب پڑھیں تو اچھی لگیں۔ عصمت آپا کی کچھ کہانیاں بھی نظر سے گزریں تو ان کے جملوں کی کاٹ، طرز تحریر اور انفرادیت نے بہت متاثر کیا۔ لیکن منٹو کی کہانیوں کا جب مطالعہ کیا تو پہلی بار مجھے

عورت کی مظلومیت کا احساس ہوا۔ اگر چہ منٹو کے بارے میں ہمارے بزرگوں کی رائے اچھی نہ تھی مگر میری رائے کچھ مختلف تھی۔ مرد ہوتے ہوئے بھی منٹو واحد ایسا فنکار ہے جس نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عورت ذات کے کرب کو پیش کیا ہے۔ ''کالی شلوار'' اور ''کھول دو'' جیسی کہانیوں پر لوگ فحاشی کا الزام لگاتے رہیں لیکن ان میں منٹو نے جس بیباکی اور فنکارانہ سچائی سے عورت کے دکھ اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی کی ہے اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

لیکن مجھے یہاں خاتون قلمکاروں کے حوالہ سے ہی کچھ گفتگو کرنی ہے۔ اوپر عرض کر چکی ہوں عصمت کی کہانیوں نے متاثر کیا ہے، مجھے قرۃ العین حیدر کی تحریریں بھی اچھی لگتی ہیں۔ ''کار جہاں دراز ہے'' اور ''آگ کا دریا'' ان کے شاہکار ناول ہیں۔ امرتا پریتم اگر چہ پنجابی کی ادیبہ ہیں لیکن مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کی تخلیقات بہت کم نظر سے گزریں مگر ان کے خوبصورت طرز تحریر نے مجھے متاثر کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی ''رسیدی ٹکٹ'' تو میں کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ''رسیدی ٹکٹ'' نہ پڑھتی تو شاید ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' وجود میں نہ آتی اور اگر آتی بھی تو بہت بعد میں۔

واجدہ تبسم کے نام کا ڈنکا بھی خوب بجا۔ حیدر آبادی ماحول پر واجدہ نے کئی خوبصورت ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ بمبئی میں ان سے ایک آدھ بار ملاقات بھی ہوئی میں ان کے اخلاق سے بھی متاثر ہوئی۔ ادھر کافی عرصے سے ان کا قلم خاموش ہے میرا اپنا خیال ہے، واجدہ نے اگر حیدر آبادی ماحول سے ہٹ کر بھی کچھ لکھا ہوتا تو اس سے یقیناً ان کے ادبی وقار میں اضافہ ہوا ہوتا۔

بشریٰ رحمن کا پہلا افسانہ ''بیسویں صدی'' کے توسط سے پڑھا۔ بشریٰ رحمن کے قلم میں بہت جان ہے، ان کے پاس لفظیات بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک معمولی واقعہ کو بھی وہ بہت متاثر کن انداز میں کہانی کا روپ دیدیتی ہیں۔ آج جو خواتین افسانے لکھ رہی ہیں ان میں بشریٰ رحمن مجھے بہت پسند ہیں۔

شاعرات میں ادا جعفری نے پہلی بار مجھے چونکایا یہ ایک نیا لہجہ تھا، ایک منفرد آواز

تھی جو آگے چل کر دوسری شاعرات کے لئے تحریک کا باعث بنی۔ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں ادا جعفری نے مروجہ شعری روایتوں کو توڑا ہے اور اس نسائی لہجہ سے ہمیں روشناس کرایا جو آگے چل کر اردو شاعری میں ایک نئے باب کے اضافہ کا سبب بنا۔ پھر کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی آوازیں ابھریں۔ نظم، ان دونوں کا خاص میدان ہے۔ ان کی نظمیں بلا شبہ اچھی ہیں اور متاثر کرتی ہیں لیکن ان کا باغیانہ لہجہ بڑی حد تک مشرقی روایات کے برعکس ہے۔ ان کی نظموں میں عورت مرد کے آپسی تعلقات کا برملا اظہار، اور سیکس کی نفسیات کا بیباک تصور بھی ملتا ہے جو کبھی کبھی بہت اکھرتا ہے۔

انہیں آوازوں کے درمیان ایک اور آواز ابھری جس کی گونج بہت جلد پوری اردو دنیا میں پھیل گئی۔ یہ تھی پروین شاکر کی آواز۔

ریل کی سیٹی میں کیسی ہجر کی تمہید تھی
اس کو رخصت کر کے گھر لوٹی تو اندازہ ہوا

یہ اس کا پہلا شعر تھا جو مجھ تک پہونچا، اس کے بعد میں اس کی گرویدہ ہو گئی۔ پروین شاکر کی شاعری کی خصوصیت نئی نئی لفظیات، نئے نئے استعارے، خیالات کا برجستہ اظہار، اور ان حسیات اور نازک ترین محسوسات کو برتنے کا سلیقہ ہے جو عورت ذات کا ہی حصہ ہیں۔ اس کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے وہ اپنی نہیں بلکہ تمام حوا کی بیٹیوں کی داستان بیان کر رہی ہے۔ اس کی غزلوں میں پہلی بار عورت بولتی ہوئی نظر آئی۔ ڈی سی ایم کے مشاعرے میں شرکت کے لئے پروین شاکر جب دہلی آئی تو میں نے اسے فون کیا، ملاقات کا وقت بھی طے ہو گیا مگر عین وقت پر کسی وجہ سے میں نہ جا سکی بعد میں فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ واپس جا چکی ہے۔ کیا پتہ تھا، اسے دنیا سے بھی جانے کی جلدی تھی۔ مجھے اس سے نہ مل پانے کا بے حد افسوس ہے اور شاید تا عمر رہے گا۔ وہ اب ہم میں نہیں ہے مگر اپنی غزلوں اور نظموں میں وہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میں نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا تو میرے سامنے کوئی نصب العین یا طے شدہ سمت نہیں تھی، بس دل کا بوجھ کم کرنے کے لئے شعر کہتی تھی۔ مطالعہ جب وسیع ہوا اور

پورے شعری منظرنامے سے واقفیت ہوئی تو میرے شعری رویہ میں خود بخود تبدیلی آ گئی۔ میری غزلوں کے مطالعہ سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میری غزلوں میں پروین شاکر کا عکس نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں سچائی ہو لیکن میں پورے یقین اور دیانتداری سے کہنا چاہوں گی کہ دانستہ طور پر ایسا نہیں ہے۔ میں پروین شاکر سے متاثر ضرور ہوں مگر میری کوشش یہی رہی ہے کہ جو کچھ کہوں اس میں انفرادیت ہو وہ میرا لگے، کسی کی نقل یا چربہ نہ معلوم ہو۔ میں پروین شاکر سے کسی بھی طرح اپنا موازنہ نہیں کرنا چاہتی، مجھے اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف ہے لیکن جب میرے اشعار سن کر لوگ پروین شاکر کو یاد کرتے ہیں تو نہ جانے کیوں اس وقت مجھے بڑی مسرت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ سمجھنے سے قاصر ہوں۔

پاکستان میں ایک اور شاعرہ ہوئی ہے۔ سارا شگفتہ، جس نے مختصر سی زندگی میں اپنی شاعری سے ادبی حلقوں میں دھوم مچادی۔ وہ ایک ایسا نصیب لے کر آئی تھی جس میں سکھ کا کوئی لمحہ نہ تھا۔ وہ جب تک زندہ رہی جلتی، سلگتی رہی اور اپنے شعروں میں آگ اگلتی رہی۔ جنسی بھیڑیے اس کے جسم کو نوچتے کھسوٹتے رہے اور پھر ایک دن اس نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔ کئی برس پہلے جب وہ ہندوستان آئی تھی تو اس نے ایک ملاقات میں کہا تھا کہ میرے پاس ازار بند نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے اس جملہ سے اس اذیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی وہ تمام عمر شکار رہی۔ اس کی نظم ”میں ننگی چنگی“ جب بھی پڑھتی ہوں، مجھے نہ صرف اس کی بلکہ پوری عورت ذات کی بے بسی اور بے چارگی تازیانے لگاتی محسوس ہوتی ہے۔

سوچتی ہوں یہ روایت کب بدلے گی؟ خاتون قلمکاروں کے تئیں مرد ذات کا نظریہ کب ٹھیک ہوگا؟ آج لکھنے والی جو خواتین شہرت و مقبولیت کی بلندی پر ہیں اور اپنی ادبی حیثیت تسلیم کرواچکی ہیں، مرد حضرات ان کی عزت و تعظیم پر مجبور ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ادبی حلقوں میں ہر ادیبہ کو بازاری شئے ہی سمجھا جاتا ہے اور اس سبب ان کا ادبی استحصال بھی ہوتا ہے۔ اس کے لئے خود ہم بھی قصوروار ہیں۔ ہم خود انہیں اس کا موقع

فراہم کرتے ہیں، ہم میں سے کچھ نہ تو شاعرہ ہوتی ہیں، اور نہ افسانہ نگار، لیکن انہیں نام اور شہرت کی ہوس ہوتی ہے وہ رسالوں میں چھپنا اور مشاعرے پڑھنا چاہتی ہیں۔ مشاعروں میں شاعرات کی اب ایک بھیڑ موجود ہے ان میں ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی بھی شاعرہ نہیں ہوتی، محض حسن، آواز، اور کسی استاد کے کلام کے سہارے بہت جلد انہیں ملک گیر شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔

سامعین ایسی شاعرات کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں لیکن پھر بھی جب وہ پڑھتی ہیں تو انہیں داد و تحسین سے نوازتے ہیں سننے میں آیا ہے کہ کچھ شاعرات تو ایسی بھی ہیں جو ہندی رسم الخط میں غزلیں لکھ کر لاتی ہیں اور فخر سے پڑھتی ہیں، بعض معتبر شعراء ان کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں، پاکستان میں ایسا نہیں ہے لیکن ہندوستان میں یہ مذموم روایت اب ایک وبائی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں کتنی ہی شاعرات مشاعرں کی دنیا میں آئیں اور غائب ہو گئیں۔ آج کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں ہے کیونکہ ان کے پاس اپنا کچھ تھا ہی نہیں۔ اس روش سے جینوئن شاعرات کا بہت نقصان ہوا ہے، المیہ یہ ہے کہ اب ہر شاعرہ کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں بزرگ شاعر خمار بارہ بنکوی کا ایک انٹرویو نظر سے گزرا جس میں انہوں نے کہا کہ ان شاعرات نے مشاعروں کو مجرا بنا دیا ہے۔ انہوں نے بڑی سچی بات کہی ہے۔ داد و شہرت کے لئے یہ شاعرات مشاعرے میں جو حرکتیں کرتی ہیں، وہ نہ صرف مشاعروں کی تہذیب بلکہ مشرقی روایات کے بھی منافی ہے۔ ایک طرف تو ادا جعفری، پروین شاکر، اور کشور ناہید جیسی شاعرات ہیں جو اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کروا چکی ہیں اور دوسری طرف یہ شاعرات ہیں جنہیں لوگ محض "تفریح کا سامان" سمجھتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہندوستان میں اچھی اور جینوئن شاعرات کا قحط ہو۔ رسالوں کی ورق گردانی کیجئے، ڈھیر سارے نام سامنے آئیں گے جو بہت ہی خاموشی سے ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ یہ اور بات کہ انہیں مشاعروں کی شاعرات جیسی شہرت حاصل نہیں، اس کے لئے بڑی حد تک ہمارے نقاد حضرات ذمہ دار ہیں۔ شاعرات کے حوالہ سے ان کے

پاس لے دے کر چند بڑے نام ہیں، جن کا وہ ہر مضمون میں حوالہ دیتے ہیں، وہ دوسری خاتون قلمکاروں کی تحقیقات کو شاید قابلِ مطالعہ نہیں سمجھتے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں شاعرات اچھے شعر کہہ رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں کہیں اندر یہ گرہ موجود ہے کہ شاعرہ اگر پاکستانی ہے تو اچھا ہی شعر کہے گی اور اگر ہندوستانی ہے تو پھر وہ جو کچھ کہے گی خراب ہی ہوگا، تنقید کا کام راستہ متعین کرنا نہیں راستے کی شناخت اور رہنمائی کرنا ہے لیکن ہمارے بیشتر نقاد راستہ متعین کرنے میں مصروف ہیں۔ ایسے میں لکھنے والوں کو روشنی ملے بھی تو کیسے؟

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہاں خواتین کے لکھنے کے لئے باوقار ماحول موجود ہے، ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور قدر کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں خواتین کی نہ تو حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے تئیں لکھے پڑھے مردوں کا رویہ بھی غیر سنجیدہ ہوتا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ محض تفریح طبع کے لئے یا پھر شوق میں لکھ رہی ہیں اس طرح حوصلہ افزائی کے نام پر ان کا استحصال کرنے کی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا ان لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو اردو ادب کے معتبر نام تصور کئے جاتے ہیں، رہی قارئین کی بات تو ان کے بارے میں "کس قیامت کے یہ نامے" باب میں بہت تفصیل سے لکھ چکی ہوں۔

ہندوستانی خواتین میں صلاحیت اور ذہانت کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مرد حضرات، خاتون قلمکاروں کے تئیں اپنا رویہ بدلیں، سماجی اور ادبی حلقوں میں انہیں عزت کی نظر سے دیکھا جائے اور حوصلہ افزائی کی جائے پھر دیکھئے کتنی ہی ادا جعفری، پروین شاکر، کشور ناہید اسی سرزمین سے اچانک منظر عام پر آ کر آپ سے اپنی صلاحیتوں اور ذہانتوں کا خراج حاصل کریں گی اور تب شاید آسانی سے یہ کہہ پانا مشکل ہوگا کہ ہندوستان کے مقابلہ پاکستان میں شاعرات اچھے شعر کہہ رہی ہیں۔!!

دیارِ محبوب میں

اے دل یہ بارگاہِ رسول عربیؐ ہے
پلکوں کا جھپکنا بھی یہاں بے ادبی ہے

ایک وہ ذکر جس کے بغیر میری داستان ادھوری ہے۔ ذکر ہے اس روحانی سفر کا جو اپریل 1990 میں ہندوستان سے سعودی عرب کے لئے کیا تھا۔ میرے لیے یہ سفر جتنا اہم، جس قدر متبرک اور حیات افروز ہے وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتا۔

بس اتنا یاد ہے کہ کعبہ بھی سامنے تھا اور رخِ حبیب بھی، سرکار دو عالم ﷺ کا تصور اتنا شدید اور گہرا تھا کہ بار بار کعبہ میرے سامنے سے غائب ہو جاتا اور اس مقام پر روضۂ سرکارؐ بلکہ پورا شہر مدینہ اجاگر ہو جاتا۔ میں پریشان ہو جاتی اور سوچتی، آخر میں کس کا طواف کر رہی ہوں؟

سوچنے والے سوچا کریں۔ فتویٰ لگائیں مگر یہ دل کے معاملے ہیں جہاں کچھ بھی اختیاری نہیں ہوتا۔ یہ باتیں صرف عاشق ہی جانتے ہیں مفتی اور واعظ نہیں۔

جب تک شہرِ نبی دیکھا نہ تھا آنکھیں بے قرار تھیں اور جب وہ مبارک لمحات آئے اور جیسے جیسے ان کا کوچہ قریب آتا گیا دل سینے سے نکل کر ان کے دیار میں بکھر جانا چاہتا تھا۔

جب ماہِ عرب کی آرام گاہ تک پہنچے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے اور معمول کے

مطابق حرم شریف کا گیٹ صبح تک کے لئے بند ہو چکا تھا۔ جس ہوٹل میں قیام تھا وہ حرم شریف کے بہت نزدیک تھا۔ باہر سڑک پر کھڑے رہ کر گھنٹوں مسجد نبوی کے ان میناروں کو دیکھتی رہی جو قرب حبیبؐ کی ضیا لے کر ستاروں سے زیادہ تیز روشن تھے۔ صاف ستھری سڑکیں، اجلے اجلے مخصوص لباس میں اہل مدینہ، فضائیں معطر، ہوائیں نغمہ بار، جس شئے پر نظر پڑ جائے ہٹانے کو دل نہ چاہے۔ طبیعت میں کیف و سرور بھی اور اضطراب بھی۔ صبح کا انتظار طویل ہو گیا۔

نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی رات نے جانے کس طرح اپنا آنچل پھیلایا کہ بے قرار لمحوں کو نیند آ گئی۔ جیسے ہی آنکھ لگی دیکھا کہ حرم شریف کے اندر روضۂ سرکارؐ کے سامنے کھڑی ہوں۔ اور ایک عربی سے کچھ پوچھ رہی ہوں، سوال تشنگی لیے ہوئے تھا اور جواب سیراب کرنے والا۔ خوشی میں آنکھیں چھلک پڑیں۔ گھبرا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ صبح ہونے تک پلکوں کی فضا نم آلود تھی۔

اذان ہوتے ہی بابِ حرم کھل گیا۔ نماز فجر حرم شریف میں ادا کر کے روضہ سرکارؐ پر پہنچی تو لگا نماز کا کوئی سجدہ باقی رہ گیا ہے۔ بقول شاعر ؎

مجھے کیا خبر تھی رکوع کی، مجھے ہوش کب تھا سجود کا
تیرے نقش پا کی تلاش تھی کہ میں جھک رہا تھا نماز میں

اور پھر یہ معجزہ بھی دیکھا کہ روح کا خالی خالی دامن چند لمحوں میں لبریز ہو گیا۔

کرتے ہیں سمندر کو قطرہ پھر قطرے کو دریا کرتے ہیں
وہ دل والوں کی بستی میں ہر روز تماشا کرتے ہیں
اے کاش کوئی دیکھے تو سہی اعجاز مسیحا کا میرے
بس ایک نظر سے وہ اپنے بیمار کو اچھا کرتے ہیں

حضرت عائشہؓ اپنے ایک شعر میں فرماتی ہیں کہ ؎

"اے زلیخا! تجھے ناز ہے کہ تیرے محبوب کے لئے مصر کی عورتوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں مگر میرا محبوب تو ایسا ہے جس کے لئے لوگوں نے اپنی گردنیں کٹوا لیں۔"

عائشہؓ کے ناز کے تصدق! جب ان کے در سے چلی تو محسوس ہوا، ریزہ ریزہ ہو کر
ان کی گلیوں میں بکھر گئی ہوں، جانے کون سا وجود ساتھ لے کر آئی۔ آج تک سمیٹنے کی
کوشش کر رہی ہوں۔!!

محبت کی زبان

تین جون 1997ء کی صبح تھی۔

وہ میری گود میں دم توڑ رہا تھا اور میں بے بسی سے آسمان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جہاں سے حکم واپس نہیں لیا جاتا۔ تھوڑی کش مکش کے بعد اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور اب وہ ساکت تھا، میرے رونے کی آواز سن کر میرے برابر والے مکان سے میری پڑوسن جمیلہ جو میری ہمدرد اور غمگسار بھی ہیں بھاگی ہوئی آئیں کہ اللہ جانے کیا حادثہ ہو گیا۔ اس وقت کمرے کا منظر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے وہ کون تھا، جس کے لئے میں اس قدر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ جی ہاں! وہ ایک محبت تھی! جو انسانی فہم سے بالا ہے اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ وہ محبت تھی جس کے لئے روزِ ازل زمین و آسمان اور پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا مگر انسان نے اسے قبول کر لیا۔

وہ جو میری گود میں مردہ پڑا تھا اس کا نام لڈو تھا۔ لڈو جو ایک مرغ تھا۔ ایک مرغ کی موت پر آنسو بہانے والے کو یقیناً لوگ پاگل، خبطی اور دیوانہ کہیں گے اور اس کا مضحکہ اڑائیں گے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں۔ یہ محبت کی باتیں ہیں جو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ یہ تو کسی کسی کے حصے میں آتی ہے ہم جانتے ہیں کہ ایسے مرغ لاکھوں کی تعداد میں روز ہماری غذا بنتے ہیں۔ مگر یہاں جو آنسو تھے وہ اس کی ہڈی بوٹی اور لذیذ گوشت سے وابستگی کے نہیں تھے۔ وہ اس محبت کے تھے جو روزِ ازل سے آدم زاد کا حصہ ہیں۔

مجھے مرغیاں پالنے کا شوق نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پرندوں سے مجھے قدرتی لگاؤ ہے۔ میرا یہ اصول رہا ہے کہ کبھی کوئی پرندہ پنجرے میں قید نہیں کیا۔ اکثر طوطے اور کبوتر خرید کرانہیں آزاد کرتی ہوں۔ اس عمل سے مجھے ایک روحانی کیف ملتا ہے۔ بلکہ اپنی چھت پر پرندوں کے لئے دانے پانی کا خاص اہتمام اور انتظام رکھتی ہوں۔ صبح وشام مختلف قسم کے پرندے میری چھت پر اترتے ہیں۔ دانہ پانی لے کر سورج چھپنے سے پہلے یہ اڑ جاتے ہیں۔ بارش وغیرہ کے موقعہ پر اگر کسی روز یہ نہیں آتے تو میں اپنے ان مہمان پرندوں کی بڑی کمی محسوس کرتی ہوں۔ گھر سے کہیں باہر رہوں تو ان کے اوقات میں گھر پر حاضر رہنا اپنی ایک ذمہ داری سمجھتی ہوں۔ یہ باتیں ہم پہ فرض ہیں نہ سنت۔ نہ کسی کتاب میں اس کی ہدایت یا حکم درج ہے۔ یہ تو خالص محبت کا مذہب ہے۔ جو صرف عاشقوں کے دل میں ملے گا۔

ایک روز مرغی کے بچے بیچنے والا گلی سے گزرا تو اس کی ٹوکری میں گول گول روئی جیسے رنگ برنگے بچے بہت پیارے لگے۔ نہ جانے کیا سوجھی کہ ایک بچہ خرید لیا۔ سفید پروں والا خوبصورت اور معصوم ابھی تازہ تازہ انڈے سے نکلا تھا۔ پرورش شروع ہو گئی۔ روئی کے پہل میں پھر جوتے کے ڈبے میں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں اس کے ڈبے کو اپنے لحاف کے اندر رکھ کر سوتی۔ رات کے کسی حصے میں جب میں بستر سے اٹھتی تو وہ ڈبے کے اندر چوں چوں کر کے پھڑ پھڑانے لگتا۔ جب اپنے بستر میں واپس آتی تو خاموش ہو جاتا۔ حالاں کہ ڈبہ کپڑے میں لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ وہ صرف میری آہٹ سن کر شور مچاتا تھا۔ میرے علاوہ گھر کا کوئی بھی فرد کہیں آئے جائے وہ چپ رہتا تھا۔ میں جب کچن میں ہوتی تو وہ میرے پیروں کے پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ میں بیٹھ کر کوئی کام کرتی تو وہ میرے کاندھے پر چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے ڈانٹتی تو میرے بالوں میں چھپ جاتا۔ جب میں شام کو چھت پر چہل قدمی کرتی تو دو گھنٹے مسلسل وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا۔ لکھنے پڑھنے کے وقت وہ کتاب یا کاغذ پر پیر رکھ کر کھڑا ہو جاتا، اور میرا منہ دیکھتا۔ ہر پل اسے میری توجہ درکار تھی۔ یہ ننھا سا ساتھی جو کہنے کو صرف ایک مرغ یا جانور تھا دھیرے دھیرے میرے دل میں جگہ بناتا چلا گیا۔

میں بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کا دل بہلانے کے لئے ایک اور بچہ لیا جو اس سے تھوڑا بڑا تھا۔ دوسرے والے سے مجھے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ بس یوں ہی! وہ میرے نزدیک صرف ایک مرغ تھا اور نہ اس کی عادتیں لڈو جیسی تھیں۔

لڈو اب دو سال کا ہو گیا تھا جب بھی اسے آواز دیتی "لڈو یہاں آؤ"۔ وہ فوراً بگٹٹ دیتا ہوا چھت کی سیڑھیوں سے اتر کر میرے پاس آن کھڑا ہوتا، اسے دیکھ کر میری بیٹی فیض مسکرا کر کہتی۔

"لڈو اب دھیرے دھیرے انسان بننے کی کوشش کر رہا ہے"۔ وہ انسان نہیں تھا لیکن اس کے اندر جیسے انسانی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جب میں کبھی اداس ہوتی یا روتی مجھے دیکھتا اور فوراً پلنگ پر چھلانگ لگاتا۔ میری گود میں بیٹھ جاتا۔ میرا چہرہ تکتا جب تک میرے آنسو جاری رہتے۔ وہ مسلسل اپنی چونچ سے کبھی دوپٹہ کبھی دامن پکڑ کر کھینچتا اور میں اس کی خوشی کے لئے اپنے آنسو پونچھ لیتی۔ وہ میرا ہمدرد تھا۔ مجھے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بھی شاید نظام قدرت ہے کہ جب انسان، انسان کا دکھ نہیں سمجھتا تو جانوروں کو یہ کام سونپا جاتا ہے مگر کام ابھی ختم کہاں ہوا تھا۔ درد باقی تھا، آنسو بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ مگر لڈو کی ڈیوٹی شاید ختم ہو چکی تھی۔ وہ چلا گیا۔ میں اسے روک نہیں سکی۔ کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ یہی نظام قدرت ہے۔ میں اپنے اس معصوم ساتھی کو شاید کبھی نہ بھلا سکوں۔ وہ جب یاد آتا ہے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس کے صاف ستھرے کشادہ دربے کو اب اس کے ساتھی نے آباد کر لیا ہے مگر میرے دل کا وہ گوشہ جو صرف لڈو کے لئے تھا ہمیشہ خالی رہے گا۔!

وہ بھی مجھ کو چھوڑ گیا

فوزیہ اور دیبا کے بعد میری گود میں فیصل آ گیا تھا۔ اس سے پہلے میں دو بیٹیوں کی ماں تھی اور اس کی سزا بھگت رہی تھی۔ فیصل آیا تو ایک امید سی بندھ گئی اچھے دنوں کی آمد کی۔ خیال تھا کہ اب سب کچھ بدل جائے گا۔ اب میں دو عدد بیٹیوں کی ہی نہیں، ایک پھول سے بیٹے کی ماں بھی تھی۔

کہتے ہیں کہ پانی کی بوند اگر مسلسل کسی پتھر پر گرے تو اس میں شگاف پیدا کر دیتی ہے مگر وہ جانے کیسا پتھر تھا کہ میرے وجود کا دریا قطروں کی صورت ٹپک ٹپک کر خشک ہو چکا تھا مگر اس پر شگاف تو کیا اس کی شکل میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ فیصل کو ہم سب پیار سے بابو کہنے لگے۔ اسے اپنے درمیان پا کر گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ یہاں تک کہ باپ بھی۔ میں بھی خوش تھی مگر جب گھر کے حالات پر نظر ڈالتی تو میری خوشیوں کا دامن یکلخت خالی ہو جاتا اور میں سوچتی۔ آخر عورت مکمل کب ہوتی ہے؟ کیا اس کی تکمیل کا عمل تا حیات جاری رہتا ہے۔

بابو بچپن سے ہی شریر ہے۔ سب کو چڑانا، پریشان کرنا، بے وقوف بنانا اس کی عادت ہے۔ ان حرکتوں پر کبھی کبھی اسے جھڑکیاں بھی ملتی ہیں اور ناراضگیاں بھی۔ لیکن اسے پروا نہیں ہوتی۔ اپنی حرکتوں پر وہ شرمندہ بھی نہیں ہوتا لیکن وہ غیر سنجیدہ بھی نہیں ہے۔ اجنبی لوگوں کے درمیان اس کی سنجیدگی دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ کبھی گھر پر جب کوئی

مہمان آجاتا ہے تو بابو کی حرکتیں انتہائی سنجیدہ ہوتی ہیں۔ اس کی ضرورت سے زیادہ سنجیدگی کو دیکھ کر ہم چاہتے ہوئے بھی اپنی ہنسی نہیں روک پاتے۔

میرا خواب تھا کہ دونوں بیٹیوں کی طرح بابو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن اس نے تعلیم سے زیادہ اپنے آبائی کاروبار میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اب اس نے سارا کاروبار سنبھال لیا ہے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اسے مصوری کا شوق ہے۔ رات گئے تک تنہائی کے عالم میں کاغذ پر تصویروں کے آڑے ترچھے خاکے بنانا اس کا محبوب شغل ہے۔ اس کا ادبی ذوق بھی معیاری ہے۔ معیاری اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں سڑک چھاپ ناول، فلمی یا جی کہانیوں کے رسالے کبھی نہیں دیکھے۔ ادبی رسائل وہ بڑے شوق سے پڑھتا ہے اسے کوئی غزل یا افسانہ پسند آجائے تو اس پر ٹک لگا دیتا ہے، بعد میں مجھے وہ ان کے متعلق بتاتا ہے۔ اچھے اور پسندیدہ اشعار اسے ازبر ہیں۔ کسی رسالہ میں اگر میری کوئی غزل شائع ہوئی اور اس کی نظر پڑ گئی تو بلا جھجک کہہ دیتا ہے۔ امی آپ کا یہ شعر کچھ کمزور ہے یا یہ شعر بہت اچھا ہے۔

اسے راتوں میں جاگنا اور دن میں سونا شاید اچھا لگتا ہے۔ کسی کی ڈانٹ کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ بسا اوقات جب ہم لنچ کے لئے بیٹھتے ہیں تو وہ ناشتہ کی تیاری کرتا ہے۔ دن میں اگر کبھی اسے چائے بنانے کے لئے کہا جائے تو انکار کر دیتا ہے لیکن رات کے دو بجے بھی اشارہ ملے تو وہ بخوشی چائے بنانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں جب وہ بمبئی سے کچھ دنوں کیلئے دہلی آیا تو ایک عجیب و غریب مگر دلچسپ انکشاف ہوا۔ رات گئے تک وہ رائٹنگ ٹیبل پر کچھ نہ کچھ بنانے میں مصروف رہتا اور ہر صبح ٹیبل پر بکھرے ہوئے کاغذ ملتے ایک روز اس کی ایک ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ جس میں دوسرے کئی شعراء کے ساتھ میرے بھی اشعار درج تھے۔ میں نے اسے دیکھ کر رکھ دیا مگر پھر ایک دن ایک خط ملا جو اس نے اپنے ایک دوست کی طرف سے اس کی محبوبہ کو لکھا تھا۔ میں نے باز پرس کی تو وہ خاموش رہا۔ بعد میں بڑی بیٹی فیض نے جب کرید کی تو پتہ چلا کہ وہ اپنے دوستوں کی طرف سے ان کی محبوباؤں کو خط لکھتا ہے اور اس کی قیمت بھی وصول

کرتا ہے۔ ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ ان خطوں میں وہ جو اشعار کوٹ کرتا ہے اس کے لئے باقاعدہ ریٹ مقرر تھا۔ ہر شعر کا الگ الگ ریٹ تھا۔ بہت اچھے شعر کا ریٹ سب سے زیادہ اور کمزور شعر کا سب سے کم۔ اس انکشاف سے یہ راز بھی کھلا کہ وہ اکثر میری بیاض کی ورق گردانی میں کیوں مصروف رہتا تھا؟ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے اس نے دلیل دی کہ میرے دوستوں کو اردو بہت کم آتی ہے۔ زبردستی مجھ سے خط لکھوار ہے تھے۔ اس لیے اپنا ریٹ مقرر کرنا پڑا۔ پھر بھی پیچھا نہیں چھوٹا۔

بابو جب تک میرے پاس رہتا ہے اس کی اول جلول حرکتوں پر کڑھتی ہوں، ناراض ہوتی ہوں لیکن جب وہ چلا جاتا ہے تو اس کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ اس کی اچھائیوں کی ہی نہیں، برائیوں کی یاد بھی دل کو تڑپاتی ہے۔ ان لمحات میں اکثر سوچتی ہوں۔ بیٹیاں پرائی ہو چکی ہیں اب ایک بیٹا ہی اپنا ہے مگر وہ بھی اپنا کہاں ہے؟ وہ تو مجھ سے سیکڑوں میل دور اس شہرِ ستم گر میں رہتا ہے جسے میں برسوں پہلے چھوڑ چکی ہوں۔ بمبئی سے بابو ہر دوسرے تیسرے دن فون پر خیریت معلوم کرتا رہتا ہے گویا اب ماں بیٹے کے درمیان خون کا نہیں صرف فون کا رشتہ باقی رہ گیا ہے۔ سوچتی ہوں اگر فون کا یہ رابطہ بھی نہ ہوتا تو شاید اس کبھی کبھی کے رشتے پر بھی کبھی کا زنگ لگ گیا ہوتا۔ ہر ماں کے کچھ خواب ہوتے ہیں جو اولاد سے وابستہ ہوتے ہیں مگر میں ایسی ماں ہوں جس کے پاس ایسا کوئی خواب نہیں رہا۔ مجھ سے یہ حق بھی چھین لیا گیا۔ جانے کیوں! اب شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک ادھوری عورت ہی نہیں ایک ادھوری ماں بھی ہوں۔ میں وہ دھرتی ہوں جو بنجر نہیں ہے۔ اس پر پھل پھول بھی آئے مگر جو خود کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکی۔ وہ بادل جو دھرتی کو شاداب کرتا ہے، جل تھل کرتا ہے میرے اوپر سے نہیں گزرا اور جو بادل برسے بھی ہیں انہوں نے انگارے برسائے ہیں، صرف انگارے۔!!

تبصرہ کیا کریں اب اپنے طرفداروں پر
ہم کو دروازوں کا دھوکہ ہوا دیواروں پر !!

یہ تلاش کب سے ہے؟

مناظر میں کھو جانے کی عادت بچپن سے ہے۔
سورج، چاند، ستارے، بادل، سمندر، پہاڑ اور رنگ برنگے پھولوں کو دیکھتی ہوں تو ذہن میں ہزاروں سوالات ابھرتے ہیں۔ اور اپنے ہی سوالوں کی بازگشت میں کھو جاتی ہوں۔ اس وقت یہ پوری کائنات ایک سوالیہ نشان بن کر احساس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ وہ ہے تو کیوں؟ یہ ہے تو کیسے؟ میں ہوں تو کب سے؟ کوئی نہیں بتاتا، کوئی بتا بھی نہیں سکتا۔ ہم زمینوں کی داستانیں نہیں پڑھ سکتے تو پھر آسمان پر لکھے کو پڑھنے کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟ اور جو لوگ پڑھ لیتے ہیں ان کا زمین والوں سے تعلق کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

کوئی چاند پر پہنچ رہا ہے تو کوئی مریخ سے رابطہ کر رہا ہے۔ سائنس ترقی پر ہے اور انسانیت تنزلی میں۔ انسان انسان کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ اب چاند اور ستاروں کو سمجھنا چاہتا ہے۔

خود سے غافل ہے خلاؤں میں سفر کرتا ہے
خود سے واقف ہو تو انسان کہاں تک پہنچے

ٹرین میں ایک بھکارن گا رہی تھی۔

معراج محمدؐ نے کیا راز جو افشاء
وہ راز خلاؤں سے ہوا پوچھ رہی ہے

پھیلائے ہوئے گوشۂ داماں تجسس
سائنس محمدؐ کا پتہ پوچھ رہی ہے

چھوٹے منہ سے نکلی بڑی بڑی باتیں کبھی کبھی بڑے بڑے دماغوں کو جھنجوڑ دیتی ہیں اور ہم دور نکل جاتے ہیں۔ ایک کھوج لے کر، ایک تجسس لے کر، پھر بھی ہمیں مکمل سراغ نہیں ملتا۔ آسمان کو چھو لیں تب بھی اپنی پرواز محدود لگتی ہے۔ ہم نادان ہیں۔ اپنے اندر کا سفر کبھی نہیں کرتے۔ کائنات سے ذات کا سفر انسان کے بھیدوں کو گرہ گرہ کھولتا ہے اور جو اس سفر پر نکل پڑتے ہیں وہ غوث الاعظمؒ، غریب نوازؒ، گرو نانک، کبیر اور میرا کہلاتے ہیں۔

شمع ان کے سفر کا کیا کہنا
چاند قدموں کی دھول ہوتا ہے

میری سوچوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔

جب کائنات کی ہر شے گردش میں ہے تو میں ایک محور پر رک سی کیوں گئی ہوں؟ ہر روز شام ڈھلے چھت پر لیٹ کر آسمان کی وسعتوں میں جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہوں! کھوئی رہتی ہوں۔ پرندوں کا جھرمٹ جب گزرتا ہے تو محویت ٹوٹتی ہے اور اس وقت قطار باندھے جاتے ہوئے پرندوں کو گننے لگتی ہوں۔ آٹھ دس میں زیادہ تر یہ جفت میں ہوتے ہیں یعنی اپنے اپنے ہم سفر کے ساتھ۔ کبھی کبھی یہ طاق عدد میں بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کا شمار کرتے ہوئے کوئی میرے اندر کہتا ہے۔ صرف تم ہی نہیں یہاں اور بھی ہیں جو تنہا ہیں۔ اپنے ساتھی سے بچھڑ گئے ہیں۔ مقدر کا قلم ایک ہوتا ہے۔ انسان ہی نہیں دوسری مخلوقات کا نصیب بھی اسی سے لکھا جاتا ہے۔

اور پھر موازنہ کرتی ہوں ان پرندوں سے انسانوں کا جو اکیلے ہو کر بھی کارواں کے ساتھ چلتے ہیں مگر انسان ایک بار تنہا ہو جائے تو اسے کوئی کارواں نہیں ملتا۔ تنہا کھاتا ہے۔ تنہا سوتا ہے اور تنہا تنہا جلتا ہے۔ تنہائی ایک جرم ہے۔ یہاں ساتھ اس کا دیا جاتا ہے جو ساتھی والا ہوتا ہے۔ روشنی کی روایت بھی بدل گئی ہے۔ جہاں اجالا رہتا ہے وہیں چراغ جلائے جاتے ہیں۔ اندھیرے کو اور گہرا کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب آخر کیوں ہوتا ہے؟

انسان انسان کو کب سمجھے گا؟ کب جانے گا؟ شاید کبھی نہیں۔ قابیل نے ہابیل کو نہیں سمجھا اور اگر سمجھ لیتا تو مصور کے خواب میں رنگ کیسے بھرتا؟ ہم تو اسکے خواب کی تعبیریں ہیں۔ گناہ، ثواب، دوزخ، جنت یہ سب اس کے بنائے خانے ہیں جس طرف انگلی اٹھا دیتا ہے اور فرماتا ہے "کُن فیکون" یعنی ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ وہ فاعل حقیقی ہے مگر تمام امور کا ذمہ دار ہمیں ٹھہرا لیا جاتا ہے۔ شاید دنیاوی نظام کا اعتدال قائم رکھنے کے لئے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر انسان گناہوں پر دلیر ہو جاتا۔ اسی لئے جرم، انصاف، عدالت، سزا جانے کیسے کیسے امتحانات سے ہمیں گزارا جاتا ہے۔ مخلوقات میں اشرف ہونے کی سندیوں ہی نہیں ملتی!

کچھ سوچ کر ہی اس کی رحمت بخشش کا بہانہ ڈھونڈھتی ہے۔ بڑے سے بڑے گنہ گار کو ایک توبہ پر بخش دیتا ہے کیوں کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، علم والا ہے، بے بسی کو پہچانتا ہے۔

اگر عمل انسان کا اختیاری فعل ہوتا تو خضر علیہ السلام کو اس بچہ کے قتل کی سزا ضرور ملتی جس کا تفصیلی ذکر قرآن پاک کی "**سورہ کہف**" میں موجود ہے۔ موسیٰ پیغمبر خدا تھے۔ پھر بھی حکمت الٰہی سمجھے بغیر ایک وقت تک خضرؑ کو قصوروار سمجھتے رہے اور ہم تو ان عظیم ہستیوں کے قدموں کی دھول بھی نہیں۔ ہمارے پاس نہ علم ہے، نہ فہم، نہ عقل، نہ دانائی، کاش ہم نابیناؤں کے شہر میں بھی کوئی دیدۂ بینا آجائے اور ہم بھی اس سے پوچھیں، موسیٰ کی طرح کہ بتاؤ ہمیں ان افعال کا حکم کس نے دیا ہے؟

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ "حضرت آدم اور حضرت موسیٰؑ کی بحث ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے حضرت آدم سے کہا کہ آپ ہمارے باپ ہیں مگر آپ نے ہمیں خراب کیا اور جنت سے نکالا۔ حضرت آدم نے کہا، "اے موسیٰ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے کلام کیلئے چنا اور آپ کے لئے اپنے دستِ قدرت سے لکھا۔ کیا آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے بھی چالیس سال پہلے مقرر فرمادی تھی"۔ یہ آدم علیہ السلام نے تین بار کہا اور اس بحث میں وہ موسیٰ پر غالب آئے۔ بخاری جلد سوم 547 کے اس صفحہ پر انگلی رکھ کر اب میں خاموش رہنا چاہتی ہوں۔!!

آخری ساتھی

میرے اندر کا سناٹا کس نے دیکھا ہے!

ہمیشہ سے تنہا ہوں۔ اس وقت بھی تنہا تھی جب بھرے پرے خاندان میں بچپن گزرا۔ شادی ہوئی ساتھی ملا تو تنہائی مزید بڑھ گئی۔ ماں بنی پھر بھی تنہائی قائم رہی۔ زندگی میں غم کا جو بھی جھونکا آیا وہ تنہائیوں کو بڑھاتا چلا گیا۔ ہمیشہ تنہا رہی۔ کبھی بھیڑ میں رہ کر، کبھی ساتھی سے بچھڑ کر۔

جب کبھی اپنے گھر میں دو سایوں کو چلتے پھرتے دیکھتی تو سوچتی واقعی یہ میرے ساتھی ہیں یا میری خوش فہمی کا بھرم؟ یہ سائے تھے میری دو بیٹیوں کے جو اب جوان ہو چکی تھیں۔ سائے تو سائے ہیں۔ انہیں کب گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ بیٹی کا مقدر تو کسی اور گھر سے بندھا ہوتا ہے۔

اور ایک شام بڑے اہتمام کے ساتھ یہ سایہ بھی مجھ سے جدا ہو گیا۔ یہ میری چھوٹی صاحبزادی تھیں جنہیں دہلی کے ایک خاندان سے منسوب کیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اب آخری ساتھی کے جدا ہونے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ یہ رشتہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے صاحبزادوں اور خادمان میں سے آیا تھا۔ جسے میں نے محبوب الٰہی کی عطا سمجھا اور فوراً قبول کر لیا۔ محبوب الٰہی کے آستانے کا خادم میرے لئے قابلِ احترام ہے۔ یہی عقیدت ایک روز مضبوط رشتے میں تبدیل ہو گئی۔

2 ستمبر 1995 کی وہ شام ہمیشہ یاد رہے گی جب محبوب کی بستی کے لوگوں نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔ شادی کا انتظام کا کانگر کے ایک کمیونٹی ہال میں کیا گیا تھا۔ دلّی کی شادیوں میں عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ بارات کبھی مقررہ وقت پر نہیں پہنچتی۔ چار پانچ گھنٹے تاخیر سے پہنچنا تو عام بات ہے لہٰذا لڑکے والوں سے بارہا میرا یہی اصرار رہا کہ بارات وقت پر لائیں مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ وقت اور وعدہ کے اس قدر پابند ہیں۔ بارات وقت مقررہ پر ٹھیک پانچ بجے ہال پر پہنچ گئی۔ وہاں ابھی کوئی انتظام نہ تھا۔ ٹینٹ والے اپنا کام کر رہے تھے۔ باورچی ابھی آیا نہیں تھا گھر والے ابھی اسی گمان میں تھے کہ بارات کم سے کم دو تین گھنٹے لیٹ تو ہوگی ہی۔ مہمان نوازی کے تمام لوازمات ابھی راستے میں تھے۔ بارات پہنچی تو اس کے استقبال کے لئے گھر کا ایک فرد بھی موجود نہ تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنی اپنی نشستوں کو سنبھالا اور انتظار کرتے رہے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو ان میں سے کسی نے ہمیں فون پر اطلاع دی اور ہمیں پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے۔ اس دوران انہیں پانی تک نہ ملا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کے واقعات میں کیسی کیسی بدمزگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ بارات تک واپس چلی جاتی ہے۔ مگر آفرین ہے ان نظامیوں پر جنہوں نے خود ہمیں تسلی دی کہ "کوئی بات نہیں ایسا ہو جاتا ہے۔"

یہ محبوب الٰہیؒ کے در کا صدقہ ہے جو شرافت اور انسانیت بن کر ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میر تقی میرؔ نے سچ کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آخری سایہ بھی جدا ہو گیا۔ ڈوبتے ہوئے سے تنکے کا سہارا بھی چھین لیا گیا۔ وہ رخصت ہو رہی تھی اور فضا میں امیر خسروؔ کا یہ گیت گونج رہا تھا۔

" کاہے کو بیاہی بدیس رے بابل مورے"

میں نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے ہم نے تو کسی ماں کو اس

قدر روتے نہیں دیکھا۔ سچ ہی تو کہہ رہے تھے۔ کوئی ماں میرے جیسی کہاں ہوتی ہے۔

دولتِ حسرت، رنگِ تمنا، سب کچھ دل کے ساتھ گیا
وقت کے ساتھ بدلتی رُت نے ہم سے کیا کیا چھین لیا!!

چلتے چلتے

اب یہ گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی آواز، نہ کوئی ہنگامہ، نہ بہنوں کی نوک جھونک، نہ ماں کی ڈانٹ، نہ کچن میں برتن کھنکنے کی آواز، نہ رات گئے تک ٹی وی کا شور، بیٹیاں گھر سے کیا گئیں کہ زندگی کا ساز ہی ٹوٹ گیا۔

آتشِ جاں سوز میں جلنا ہی میرا مقدر ہے یہ جانتے ہوئے بھی جانے کیوں کبھی کبھی مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ اپنے خوابوں اور خواہشات کا ہر گوشہ فرض کی دیواروں میں زندہ چن کر میں تو مطمئن تھی۔ اب کیوں یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش کوئی اپنا ہوتا! جسے صرف اپنا کہتی اور وہ میرے دکھ درد کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیتا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ دن بھر کھانا نہ کھاؤں تو کوئی کہنے والا نہیں کہ "نہ کھانا صحت کے لئے مضر ہے چلو اٹھو کھانا کھا لو۔" یا تیز بخار میں پڑی ہوں تو کوئی زبردستی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ ہر روز چھت کو تکتے تکتے رات گزر جاتی ہے اور کہیں سے یہ آواز نہیں آتی کہ "اب تو سو جاؤ!"

مطلب کی دنیا ہے ساری
بچھڑے سبھی باری باری

کیسٹ پر یہ نغمہ سنتے سنتے اب تو میرے گھر کے در و دیوار بھی حساس اور سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ کوئی آہٹ اب چونکاتی نہیں۔ کسی غم سے نہ رنجیدہ ہوتی ہوں نہ کوئی خوشی اب مجھے شاد کرتی ہے۔ رشتوں کا درد سمیٹتے سمیٹتے خود بکھر چکی ہوں۔

کیا ہے وقت نے خیرات کی طرح تقسیم
میں اپنی ذات کے ٹکڑے کہاں کہاں دیکھوں!

یہ کیسی تھکن ہے؟ کیسی بیزاری ہے؟ کیسا جمود ہے! کیسی بے بسی ہے؟؟؟ جو سفر کے کسی بھی پڑاؤ پر ٹھہرنے سے روکتی ہے!

جب بھی کوئی آرزو میرا تعاقب کرتی ہے میرے اندر جلتے ہوئے الاؤ تک پہنچ کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ وہ بت جو برسوں پہلے میرے اندر نصب کیا گیا تھا اسے یہ آگ کیوں نہیں جلاتی؟ وہ نہ ٹوٹتا ہے، نہ بکھرتا ہے، نہ دھندلا پڑتا ہے۔ کسی موسم کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ وہ کسی حادثے کی زد میں بھی نہیں آتا۔ کس قدر محفوظ ہے۔ کتنے چہرے فنا کے سمندر میں اتر گئے۔ مگر اسے کبھی موت نہیں آئی ہاں اتنے برسوں میں یہ ضرور ہوا کہ اس نے اپنی شکل بدل لی۔

ڈوبتی ابھرتی پرچھائیوں کے درمیان ایک پیکر ابھرا جو تمام سایوں پر محیط ہو گیا۔ جیسے چھوٹی چھوٹی ندیاں بڑے سمندر میں منتقل ہو گئی ہوں! اور اس سمندر کے شور میں میرا اپنا وجود گم ہوتا چلا گیا۔ دیا بدل جانے سے لو کی تپش کم نہیں ہوتی۔ آج بھی احساس کا ہر پل آتش انگیز ہے۔ میرے اندر کا مہمان کل بھی میرے لئے اجنبی تھا اور آج بھی ناآشنا ہے۔ جستجوئیں ختم نہیں ہوتیں راستے بدل لیتی ہیں۔ آج بھی وہی اضطراب ہے، وہی بے چینیاں، وہی گھٹن، سفر جانے کتنا طویل ہو گیا ہے۔ منزل کا سراغ نہیں ملتا۔ جانتی ہوں کہ راستے کے نصیب میں صرف گرد ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی جانے کون سی آس ہے۔ کیسی امید ہے جو لمحہ بہ لمحہ زندگی کو دبے پاؤں لے کر گزر رہی ہے۔ ان راہوں سے جہاں دکھوں کی ٹیس سے انسان چیخ چیخ پڑتا ہے۔ مگر یہ کیسا صبر ہے، یہ کیسا امتحانی سفر ہے کہ میں اُف تک نہیں کرتی۔ آہ بھی اب آسمان پر نہیں جاتی۔ پتھریلے راستوں پر شاید یہ بھی جم سی گئی ہے۔ اس کی تمنا ہے جو دسترس سے باہر ہے۔ اس کی تلاش ہے جو زمین پر بستا ہی نہیں۔ پھر کیوں اسے جاننا چاہتی ہوں، پہچاننا چاہتی ہوں، کیوں اسے ڈھونڈنے نکلتی ہوں۔ ستاروں کی چھاؤں میں، چاندنی راتوں میں، ہواؤں کے آنچل پر، سمندر کی لہروں میں، پہاڑوں اور ریگ زاروں میں، وہ کہیں نہیں ملتا، تھک ہار کر واپس آ جاتی ہوں، وہ کبھی گلہ مند بھی تو نہیں ہونے دیتا کہ اس سے پوچھوں!

جب بجز تیرے کوئی دوسرا موجود نہیں
پھر سمجھ میں نہیں آتا تیرا پردہ کرنا

حسرتیں جل چکی ہیں، خواہشیں شرمندہ ہیں۔ زندگی کا ہر خواب سر جھکائے پشیمان سا کھڑا ہے۔ رات کے سناٹے میں ہر روز کہیں قریب سے یہ آواز آتی ہے۔

"اے آرزوئے خام میرا پیچھا نہ کر"

اس لمحہ بے بسی سے میں اپنے پیروں میں پڑی ایک زنجیر دیکھتی ہوں۔ اور پھر اس گھر کو دیکھتی ہوں جو میرا گھر نہیں میری دفن گاہ ہے، جہاں میں بے گور و کفن قید ہوں، میں یہ بھی جانتی ہوں۔ مجھے اس قید سے چھڑانے اب کوئی نہیں آئے گا۔ کسی کے بس کی بات بھی نہیں۔ یہ زنجیر کٹ نہیں سکتی۔ ٹوٹ نہیں سکتی۔ اسے توڑنے کی کوشش میں، میں خود ٹوٹ ٹوٹ کر کئی بار بکھر چکی ہوں، زخمی ہو چکی ہوں، یہ زنجیر میں نے خود پہنی ہے۔ اپنی مرضی سے خود کو اسیر کیا ہے۔ مجھے اپنے قید خانے کا ہر لمحہ عزیز ہے۔ میری زنجیر کی ہر کڑی مقدس ہے۔ حیات بخش ہے۔ اس کے لمس سے زندہ ہوں۔ اسے چھو کر زندگی ملتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ایک پل کے لئے بھی میرے لئے سانس لینا دشوار ہو جائے۔ میرا سب کچھ اس زنجیر پر تصدق ہے۔ میری زندگی ڈوبتے سورج کا ایک منظر ہے۔ مجھ سے ملنے کے لئے یارانِ عدم منتظر ہیں۔ اور میں بابِ زنداں پر کھڑی سوچ رہی ہوں کیا واقعی اجل آئی تو یہ زنجیر کٹ سکے گی۔؟

مجھے زندگی کے اس سفر میں جو درد ملے، جو تجربے ہوئے یا مشاہدات کئے وہ صفحۂ قرطاس پر حرف حرف بکھیر دیا ہے۔ پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ میرے بعد میری اس کتاب کو کوئی منظرِ عام پر لا سکتا ہے تو یقیناً زندگی کے آخری لمحوں تک لکھتی رہتی۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کہانی کا ایک انجام ہوتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ میری کہانی ابھی جاری ہے اور وقت مجھے لکھ رہا ہے۔ برِدست اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ میری آخری حسرت ہی شاید میرا انجام ہو!

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو انہیں پیا ملن کی آس !!

✪✪✪
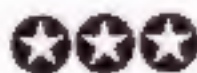
کاش! جنت میں آدم کا دل بغیر
حوّا کے بہل جاتا.....! اے حوّا تو نے عالم
وجود میں آکر قیامت تک کے لئے ہم عورتوں
پر دکھوں کا پہاڑ توڑ دیا.....!!

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی آنکھوں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

(آپ بیتی سے ایک اقتباس)